قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا بہتّرواں سال

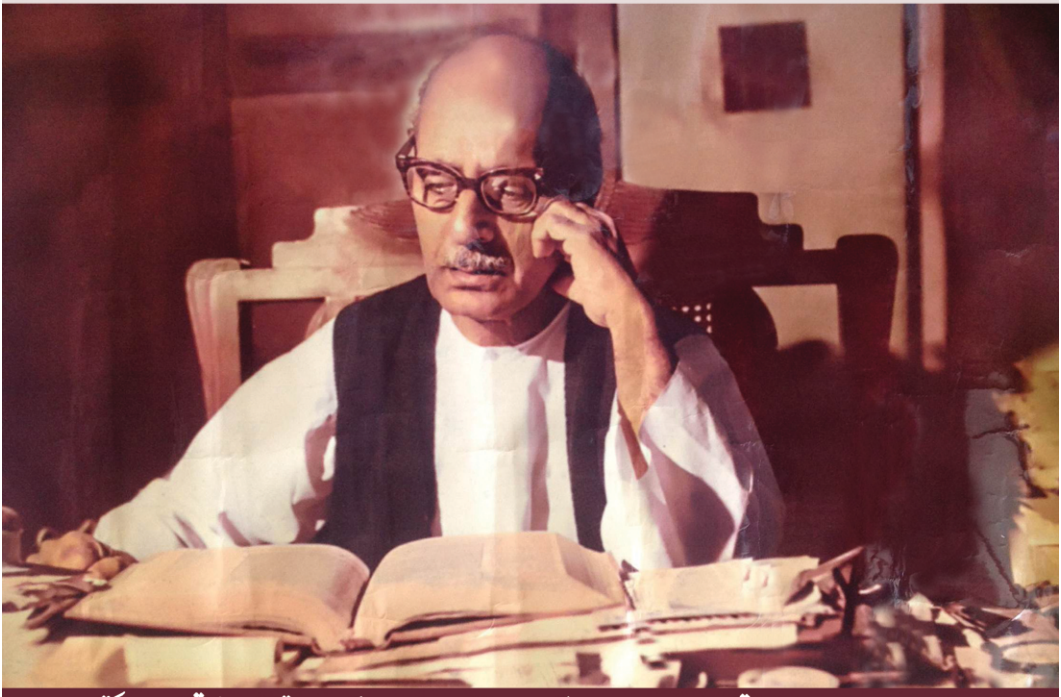
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

فروری 2015ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جو قوم مستقل اقدار پر ایمان نہ رکھے وہ سائنٹیفک ترقیوں (یعنی کائناتی قوتوں کی تسخیر) میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائے۔ کبھی اطمینان وسکون کی زندگی نہیں بسر کرسکتی۔ چنانچہ وہ اسی قسم کی اقوام سابقہ کے احوال وکوائف بیان کرنے کے بعد کہتا ہے۔ وہ عقل وہوش بھی رکھتے تھے اور فکر ودانش بھی۔ لیکن جب انہوں نے آیات اللہ (اللہ کی متعین کردہ اقدار) سے انکار کیا تو ان کی عقل وبصیرت ان کے کسی کام نہ آسکی۔ اور وہ تباہ وبرباد ہوگئیں۔ 46:26

(علامہ پرویزؒ کی کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کے صفحہ نمبر 342 سے ایک اقتباس)

جلد 68 شمارہ نمبر 02 فروری 2015ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: دانائے راز	ادارہ	4
بیوروکریسی بمقابلہ مذہبی پیشوائیت	ادارہ	9
فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر	جمیل احمد عدیل	12
ق ص ص	لغات القرآن	18
مومنین کی قرآن میں دی گئی ایک نمایاں نشانی	ڈاکٹر انعام الحق	23
حقیقی جمہوریت کے لئے انتخابی اصلاحات (چند تجاویز)	ملک منظور حسین لیل	24
متحرک نفسیات	راجہ عبدالعزیز	31
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	41

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Naba* (النباء) – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 30: Chapter 3 Translated by: Dr. Mansoor Alam 47

دفتر کا پتہ 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546

E-mail: idara@toluislam.com

ناشر و چیئرمین

محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465)۔ لاہور

ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

NAVEED GRAPHIC 5.5x8

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زور بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

لمعات

دانائے راز

(غلام احمد پرویز کے مختصر حالاتِ حیات)

علامہ اقبالؒ نے دمِ واپسیں فرمایا تھا:

سرُودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

علامہ غلام احمد پرویزؒ (رحمتہ اللہ علیہ) کی ولادت مورخہ 9 جولائی 1903ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ آپ کے دادا' مولوی' چوہدری' رحیم بخش حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک ممتاز بزرگ ہونے کے علاوہ ایک ماہر طبیب اور سنسکرت کے عالم تھے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ابتدائی تربیت اپنے دادا کی زیرنگرانی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہ کی مشرقی مغربی افقین کافی وسیع اور ''باطنی علوم'' کی گہرائیاں کافی عمیق ہو چکی تھیں۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے اور 1954ء میں جب کہ آپ وزارتِ داخلہ میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تا کہ اپنے قرآنی مشن کو پورا وقت دے سکیں۔

اس دوران میں آپ کی زندگی علمی معرکہ آرائیوں سے عبارت رہی۔ 1932ء میں ابوالکلام آزاد کے تفسیری ترجمہ' ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ انہوں نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلے میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ:

''عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔''

علامہ پرویزؒ کی بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ نظریۂ اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے قرآن کی نہیں۔ اس لئے آپ نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) (سید سلیمان ندوی کی زیرِ ادارت) کی جنوری 1933ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

اس زمانے میں ابوالکلام آزاد کی شہرت ثابہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت اور وہ بھی ایک ''غیر مولوی'' کی طرف سے کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن یہ علامہ پرویزؒ کی جرأتِ ایمانی تھی کہ آپ نے سب سے پہلے اس تفسیر پر اپنی تنقید شائع کی۔

1926ء میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند قادیانی مسلک اختیار کرنے سے مرتد ہو گیا ہے لہٰذا اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ مقدمہ قریب نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخر الامر محمد اکبر صاحب (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ علامہ پرویزؒ کے ایک مضمون ''میکانکی اسلام'' میں ضمناً بیان کردہ نبی کی تعریف کی بنیاد پر سنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں وضاحت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح قادیانیوں کو پہلی بار کافر قرار دینے کی علمی بنیاد علامہ پرویزؒ کی فراہم کردہ تھی۔ بعد میں آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب ''ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت'' 1974ء میں شائع کی۔

علامہ اقبالؒ کے خاکہ کے مطابق جناب پرویزؒ نے سلسلہ ''معارف القرآن'' کی ابتدا 1928ء میں کی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا۔ ''اللہ'' جو بعد میں ''من و یزداں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر ''ابلیس و آدم'' تحریر کی۔ جس میں آدم۔ ابلیس۔ ملائکہ۔ جن۔ شیطان۔ وحی۔ رسالت وغیرہ عنوانات پر قرآنی تصریحات پیش کی گئیں۔ معارف القرآن کی تیسری جلد ''جوئے نور''۔ چوتھی جلد ''برقِ طور'' اور پانچویں جلد ''شعلۂ مستور'' حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کرامؑ کے حالات زندگی کو محیط ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ بعنوان ''معراجِ انسانیت'' شائع کی۔ وحی کی ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سال کی فکری کاوشوں کا نچوڑ۔۔ ''انسان نے کیا سوچا''۔ کے عنوان سے ایک کتاب میں پیش کیا۔ جس کو پڑھنے سے یہ حقیقت ابھر اور نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ عقلِ انسانی۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہی ہے اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ وحی کی رو سے انسانی مسائل کا حل کیا ہے۔ آپؒ نے ایک کتاب بعنوان ''اسلام کیا ہے؟'' شائع کی۔ معاشی مسئلہ ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس دور میں معاشی نظریات کی بنیاد پر دنیا دو بڑے بلاکوں میں منقسم تھی۔ اس مسئلہ کے قرآنی حل کو پیش کرنے کے لئے آپ نے متعدد تقاریر کیں اور مضامین شائع کئے جن میں سے کچھ ''خدا اور سرمایہ دار'' نامی کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط تصنیف ''نظام

ربوبیت'' شائع کی۔

تقدیر کا مسئلہ صدیوں سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے آپؒ نے ''کتاب التقدیر'' تحریر کی۔ آخرت کے متعلق قرآنی توضیحات کو ایک کتاب بعنوان ''جہانِ فردا!'' میں شائع کیا اور اس طرح قریب چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے سلسلہ معارف القرآن کو تکمیل تک پہنچایا۔

علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ دیگر قوموں کے تصورات کس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر اثر انداز ہوتے گئے اور یوں قرآن کے تصورات کی جگہ غیر قوموں کے تصورات نے لے لی۔ چنانچہ آج جسے مذہبِ اسلام کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں سے مستعار تصورات کا جن پر لیبل قرآنی اصطلاحات کا لگا دیا گیا ہے۔ ان تصورات سے اور تو اور عربی زبان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ کا کوئی ایسا لغت مرتب کیا جائے جس میں نہ صرف الفاظ کے وہ معنی دیئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے بلکہ ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی تصورات کی بھی وضاحت کی جائے۔۔۔۔ یہ کام ایک آدمی کے کرنے کا نہ تھا' لیکن اگر انسانوں کی ایسی جمعیّت موجود نہ ہو تو؟ جناب پرویز ہمت ہارنے والے نہ تھے چنانچہ آپ نے چار جلدوں میں ایک ایسا لغت تیار کر دیا جس کی تیاری میں اپنی قرآنی بصیرت کے علاوہ قریب پچاس عربی لغت حوالے کے لئے استعمال کئے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ جناب پرویزؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطۂ عوامی کے ایک آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآنِ مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا' یا ہو رہا ہو' ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کون سی ہے جس کے زیر انتظام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی' جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی' نہ جماعت' نہ کوئی مالی ذریعے تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں

نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیر لبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابل فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد، رابطۂ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی، تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن کیا بات ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے، سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے (اس نے اسے بتا دیا تھا)۔''

(طلوع اسلام، دسمبر 1978ء صفحہ 49)۔

سلسلۂ معارف القرآن اور لغات القرآن کے علاوہ جناب پرویزؒ نے ''مفہوم القرآن'' تین جلدوں میں مرتب کیا۔ قریب ڈھائی ہزار عنوانات کے تحت قرآنی مضامین کو مرتب کر کے ''تبویب القرآن'' شائع کی اور ''مطالب الفرقان'' کے نام سے تفسیر مرتب کر رہے تھے جس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) اور ''طاہرہ کے نام خطوط'' قرآنی تعلیمات پر مشتمل ادب پارے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اسلامی معاشرت اور پھر قرآن کے بیان کردہ قوانین۔ بعنوان ''قرآنی قوانین'' اور انگریزی زبان میں کتاب۔۔۔۔ (Islam a Challenge to Religion) اس پر مستزاد ہیں۔ غرض کس کس کاوش کا ذکر کیا جائے۔

ان علمی کارناموں کو سرانجام دینے کے علاوہ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ کے ارشاد کے مطابق دہلی سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری کیا جو اپنے پہلے دور میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے آپ نے تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علماء کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جا سکتی۔

قائداعظمؒ پروٹوکول کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ انہیں کوئی شخص پیشگی وقت لئے بغیر نہیں مل سکتا تھا لیکن یہ شرف جناب پرویزؒ کو حاصل تھا کہ آپؒ کسی بھی وقت قائداعظمؒ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ باوجود اتنے قریب ہونے کے جناب پرویزؒ نے کبھی اس بات کو

فخریہ بیان نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان بن جانے پر کوئی مراعات حاصل کیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپؒ نے دوبارہ طلوع اسلام شائع کرنا شروع کیا۔ جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان کے دشمن عناصر بھی یہاں ہجوم کر کے آ گئے اور یہاں آ کر پر پرزے نکالنے لگے۔ اب ان کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم اگر پاکستان بن ہی گیا ہے تو اس میں وہ نظام نہ رائج ہونے دیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ اسلام کی آڑ میں یہاں تھیا کریسی رائج کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب دوبارہ جناب پرویزؒ کو ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا۔ قراردادِ مقاصد اور علماء کے بائیس نکات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر جناب پرویزؒ نے تفصیلی تنقید کی۔ آپؒ نے تفصیلاً بتایا کہ جسے علماء سنت کہتے ہیں وہ نہ تو متفق علیہ ہے کہ اس کی رو سے کوئی متفق علیہ قانون مرتب کیا جا سکے۔ علماء کا سنت پر اس قدر زور دینا محض اس لئے ہے کہ یہاں قرآنی نظام رائج نہ کیا جا سکے۔ مخالفین سے آپؒ کے پرزور دلائل کا جواب تو بن نہ پڑا۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف فتویٰ کفر دے دیا جس پر ایک ہزار ''علماء'' کے دستخط ثبت تھے۔

ضخیم تصانیف کی لمبی فہرست۔ ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزار ہا صفحات۔ ہفتہ وار درس اور تقاریر کے ٹیپس (Tapes) کا ڈھیر جو اب سی ڈی/ ڈی وی ڈی کی شکل میں دستیاب ہیں نیز تسوید کے بعد طباعت بھی ہو چکی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں، باوجود سرکاری ملازم ہونے کے سرگرم شمولیت، قائداعظمؒ سے قرب حاصل ہونے کے باوجود مراعات حاصل کرنے سے انکار، اپنے خلاف کفر کے فتوؤں سے بے پرواہو کر اپنے مشن میں مگن۔ اپنی ہزار سالہ تاریخ کھنگال ڈالئے۔ ہے کوئی ایک بھی ایسا شخص جس نے تنِ تنہا اتنا زیادہ اور اتنا ٹھوس کام کیا ہو؟

5 اکتوبر 1984ء کو آپ نے آخری بار درسِ قرآن دیا اور اس کے بعد مسلسل بستر علالت پر رہے۔ اور 24 فروری 1985ء کو شام چھ بجے آپؒ اس دارفانی سے انتقال فرما گئے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (55:26-27)

کیونکہ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

☆.....☆.....☆

بیوروکریسی بمقابلہ مذہبی پیشوائیت

(پرویز صاحب کی تحریروں سے ایک انتخاب)

بیوروکریسی

یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) ''نوکر شاہی'' آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ اس مشین کا آپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلقہ ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسانوں سے ہوتا ہے' مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (Materialism) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کر لیا گیا۔ اسے کہتے ہی (Mechanical Concept of Life) ہیں۔ اس سے انسانوں کے (Human Beings) ہونے کا تصور ختم ہو گیا اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم ونسق کے لئے بھی کچھ قواعد وضوابط منضبط کئے اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد وضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (Case) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ' اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظام حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی ''میزوں کی حکومت'' (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل۔ دیانت دار۔ ذمہ دار۔ معتمد علیہ افسر' اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر' انکے معاملات کا متعلقہ قواعد وضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا' اور افسران بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے' نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد وضوابط کی رو سے (میکانکی طور پر) کر دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے ''انسانیت'' پر کیا گذری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار لگے' درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطراب پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد وضوابط کے مطابق، دیانتدارانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (Human-consideration) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا..... وہاں ترجیح ''فارمز کے پر کرنے'' کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب واضطراب اور عدم سکون واطمینان ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ انداز عمل، ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو، ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیّات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے گھر کی زندگی بھی ''بابو آنہ'' بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:

(Un-Touched by Hand During Manufacture)

ان کے بنانے میں ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل (Robots) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔ (۱) جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں لوچ کیسے آ سکے گی۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

بملا زمان سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے

''نوائے دل گداز'' سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ''جہاں گیری'' تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ ''یوسفِ بے کارواں'' کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اٹھتے ہیں تو دفتروں کا رخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اس کے پاس کبھی اس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آ جاتے ہیں۔ میر تقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ ؎

ترے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابل رحم ان کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائر ہوتے ہیں تو ''فتوحاتِ بالائی'' کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے، وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن پنشن اسی دن نہیں مل جاتی اسے منظور کرانے کے لئے دنوں مہینوں سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بت ہیں جنہیں

اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی انہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے اور انہیں بھی کسی کے حال زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرض مند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد وضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر یہ رسوم پرستی اور ہی گل کھلاتی ہے۔ الدین زندگی کے حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر وعمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے جسے الدین نے متعین کیا ہے۔ اور وہ مقصد ہے۔ **مَا يَنْفَعُ النَّاسَ** (13:17) ''جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو''۔ اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے' اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں انسان کے ایک ایک قدم کے لئے متعین ''شرعی احکام'' منضبط ملیں گے۔ بیٹھو اس طرح۔ اٹھو اس طرح۔ چلو اس طرح۔ سوؤ اس طرح۔ کھاؤ اس طرح۔ پیو اس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔ بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔ حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد وضوابط ہوں گے۔ ان قواعد وضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد' ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان احکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ **عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا** ..... قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رو سے تمہارا نان ونفقہ تو میرے ذمے ہے' علاج معالجہ نہیں۔ اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔ اس قسم کی بن جاتی ہے ''فطرت'' ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق وفاجر' جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔ اس سے وہ عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے' نہ انسانیت کی لچک۔ بیوروکریٹک کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔ جس طرح ان کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا' ان کے ہاں بھی ساری زندگی ''مکروہ اور مباح'' کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے۔ اور ان کے فتوؤں میں انسانی زندگی کہیں بار نہیں پاتی۔ یہ انسان نہیں' قرآن کے الفاظ میں ''خشب مسندہ'' بن کر رہ جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

شجر کاری

باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو قرآن فہمی اور باغبانی ہے۔

آیئے ماہ فروری 2015ء میں دوستوں کے تعاون سے شجر کاری کی مہم میں حصہ لیں۔

اور پاکستان کو سبز انقلاب کی طرف لے جائیں۔

(باغبان ایسوسی ایشن)

جمیل احمد عدیل

فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے یہ کوئی تیس بتیس سال پرانی بات ہے یعنی یہی کوئی آٹھ دس برس کی عمر میں ہماری سماعت سے یہ فقرہ ٹکرایا تھا ''لو جی! مسلمانوں میں پرویزیوں کے نام سے ایک نیا فرقہ ایجاد ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ ہمارے ایک پیر پرست مہربان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ صاحب پاکپتن میں ہمارے میزبان تھے۔ یہ تھا ''فکرِ پرویز'' سے ہمارا پہلا تعارف۔ عہدِ طفولیت میں بھلا ہمیں اس ''فرقے'' سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، تاہم تجسس کا پہلا بیج اسی دن بویا گیا۔ کئی سال گزر گئے لیکن نہ جانے کیوں متذکرہ نیم طنزیہ تعارفی جملہ ہمیں بھولا نہیں، تا آنکہ ہمیں دسویں جماعت میں ایک بزرگ استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ رحیم بھٹہ صاحب اس ہستی کا اسم گرامی ہے۔ جواب کافی معمر ہو چکے ہیں۔ ''جماعت احمدیہ'' کے برگزیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں رحیم صاحب کے بے حد احترام کے باوجود ان کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے متعلق اور کیا کہیں بس غالبؔ کا یہ شعر عرض کر سکتے ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس عاجز پر رحیم صاحب کے لاتعداد احسانات میں سے سرفہرست یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ''فکر پرویز'' سے باقاعدہ متعارف کروایا۔ ان کی وساطت سے ہی غلام احمد پرویز کی تصنیف ''قتلِ مرتد'' ہمیں ملی۔ میٹرک کا سٹوڈنٹ ایک علمی کتاب سے جتنا استفادہ کر سکتا ہے، ہم نے بھی کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ کم وبیش ربع صدی گزر جانے کے باوصف نہ صرف اس کتاب کے مندرجات ہمیں اچھی طرح یاد ہیں بلکہ اس حوالے سے پرویز صاحب کے مثبت نقطہ نظر نے مستقل ہمارے قلب و ذہن میں جگہ بنا لی۔ بعد میں ایسی کئی تقریریں اور تحریریں ہماری سماعتوں اور بصارتوں سے ٹکرائیں جن میں ارتداد کو جرم ثابت کرنے کے لئے بعض روایتی سوچ رکھنے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، لیکن سچی بات ہے ان کی ایک بات بھی دل کو نہ لگی۔ اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق پرویز صاحب نے جو صراحت کی، وہ اتنی معقول ہے کہ اس کا ہر جواب پوچ ہے۔ بعض علمی مجالس میں ہم نے ''رسک'' لے کر اس باب میں بعض ثقہ علماء کرام سے براہ راست استفسارات کر کے بھی دیکھ لیا، لیکن جواباً ہمیں قابل رحم عجز کا مشاہدہ ہی کرنا پڑا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ محض ایک شخص کی معاندت اور غیر مستند تاریخ و روایات کی صنم پرستی نے انہیں کیسے دن دکھا دیئے ہیں کہ کائنات کی پاکیزہ ترین شخصیت ﷺ کا تقدس بھی انہیں عزیز نہیں رہا کہ بلا جھجک زبان پر ایسی ناروا باتیں لے آتے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے ایک عام اور گنہگار مسلمان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں راستی کا راستہ دکھائے۔

قصہ مختصر علم وادب سے وابستگی جیسے جیسے پختگی کے مراحل طے کرتی گئی غلام احمد پرویز مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ جاری رہا۔ اگرچہ

اس دوران میں کئی پڑاؤ آئے طویل وقفے بھی آئے ۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

1983-85ء کا عرصہ بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں گزرا۔ ہوسٹل میں مقیم رہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ 25/B گلبرگ 2۔ پرویز صاحب کی رہائش ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ آپ ہر ہفتے درس قرآن دیتے ہیں۔ ''ثواب طاعت وزہد'' جاننے کے علی الرغم جانے کیوں طبیعت ادھر نہیں آئی۔ تعلق خاطر جانے کس کس نوع کے دار و رسن کی اور لئے پھرا بس ادھر رخ نہ ہوسکا ''ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا''۔ حقیقت یہ ہے سب سے بڑی نعمت' نعمت کی موجودگی کا احساس ہے اور ہمیں بھی اس نعمت کا احساس اس دن ہوا جب یہ نعمت روئے ارض پر موجود نہ رہی۔ ایک دم قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''چندراوتی'' کا پہلا فقرہ یاد آیا ہے:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا.....''۔

صاحبو! ہم وہ تاریخی دن کیسے بھول سکتے ہیں' جی ہاں 25 فروری 1985ء (1) ہم اپنے کزن سے ملنے ایف۔سی کالج سے ریواز گارڈن گئے۔ واضح رہے ان دنوں ہمارے پاس ایگل کی بائیسکل ہوا کرتی تھی اور پورا لاہور اس کے دو پہیوں کی گردش میں سمٹنے پر مجبور بلکہ ''مجبورِ محض'' تھا۔ وہیں ریواز گارڈن میں اخبار کے پہلے صفحے پر ہماری نظر پڑی' پرویز صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر نے بے کل کر دیا۔ ان کی موت سے زیادہ افسوس ہمیں یہ لاحق ہوگیا کہ اتنا قریب ہونے کے باوجود ان سے مل نہیں سکے' انہیں سن نہیں سکے' ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ اسی تاسف نے جسم و جاں میں ایک عجیب سی توانائی بھر دی' اپنی سائیکل اٹھائی' ریواز گارڈن سے سیدھے 25/B گلبرگ پہنچے۔ سفر آخرت کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ پرویز صاحب ایک چارپائی پر پڑے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان گنت احباب اردگرد موجود تھے' کہیں آنسو رواں ہیں' کہیں دبی دبی سسکیاں تو کہیں قدرے بلند آواز میں گریہ۔ پرویز صاحب کے بھائی (مرحوم) ڈاکٹر عارف بٹالوی سب کو تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے اور خود روتے بھی جا رہے تھے۔ ہم نے بار بار جی بھر کے اس عظیم انسان کو دیکھا جس نے ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ برآمدے میں ایک عمر رسیدہ شخص اونچی آواز میں اپنے محسن پرویز صاحب کو یاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مرزا سلطان بیگ (نظام دین) تھا۔ جنازہ روانہ ہوا۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل رہے۔ منی مارکیٹ کی گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو بھی ہم موجود رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ان کے کسی عزیز نے دور سے (غالباً کراچی سے) پہنچنا تھا' چنانچہ تدفین کے مرحلے کو کچھ مؤخر کر دیا گیا کہ فلائٹ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس دوران میں کہ ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی' پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔ ان دنوں رامے صاحب کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا' بے حد متنازع ہونے کی وجہ سے ہر حلقے میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اس خاکسار نے اس مضمون کی بابت رامے صاحب سے جو دو ایک سوالات پوچھے تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ بڑی گرما گرم باتیں ہوئیں۔ واپس آ کر اس گفتگو کے تضمنات پر مبنی اور پرویز صاحب کے آخری سفر کی روداد' جو دس بارہ صفحات پر مشتمل تھی' ہم نے رحیم صاحب کو خط کی صورت میں بھیجی تھی' کیا عجب ان کے پاس یہ مفصل خط محفوظ ہو۔

بہرنوع وقت کا دریا اپنے غیر متعین تعینات کے ساتھ بہتا رہا۔ ہم ''طلوع اسلام'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آدھ کنونشن میں شریک ہونے کی سعادت بھی ملی۔ کبھی کبھار پرویز صاحب کی کسی کتاب میں سے بھی گزرنے کا موقع ملتا رہا۔ ''فکر پرویز'' سے تعلق رکھنے والے دوستوں' اسلم صابر صاحب' محمود الحسن صاحب' ڈاکٹر اسلم نوید صاحب اور دیگر منسلکین سے رابطے رہے' مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا' ذہنی افق پھیلتا رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ پرویز کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ اب سے کوئی تین سال قبل کی بات ہے کہ یہ عاجز بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں مقیم تھا۔ وضاحت کر دیں کہ ہمارا تعلق شعبہ تدریس سے ہے۔ کوئی 15/16 سال ہو گئے ہیں' مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہوئے۔ 2001ء میں جب ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کا ڈول ڈالا گیا تو ہماری رضا معلوم کیئے بغیر ''جبراً'' ہمیں کلاس روم سے اٹھا کر آفس میں بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے عامیوں کی نگاہ میں ''ڈائریکٹر کالجز'' ہونا عزت کی بات ہو پر ہمیں تو یہ سراسر قید بامشقت کے مشابہ عمل محسوس ہوا۔ لہٰذا دو اڑھائی سال مسلسل سفارشیں ڈھونڈتے رہے کہ کوئی ''رجل غیب'' ہمیں اس جھنجٹ سے نجات دلا دے' ہم باز آئے اس ''ایجوکیشن افسری'' سے۔ سیدھی سی بات ہے ہم تو انہیں لفظ و حرف ہی ماننے کو تیار نہیں جو لٹریچر (علم و ادب) سے واسطہ نہ رکھتے ہوں اور یہاں تو اعداد تھے' ہندسے تھے' لایعنی میٹنگز تھیں' انکوائریاں تھیں ٹیکنیکل انسپیکشنز تھیں' فزیبلٹی رپورٹس تھیں' Expenditure State Ments تھیں' آڈٹ تھے' جی حضوری کی ایک زنجیر تھی۔ دستور یہی تھا کہ اوپر والوں کی ہر نامعقول بات ہنسی خوشی سہو اور نیچے والوں پر خوب خوب رعب گانٹھو۔ کیا عرض کریں اس افسری لائن میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں' چنانچہ اب بھی یہ گنگناتے رہتے ہیں' ''جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ ''افسر'' یاد آتے ہیں۔''

خیر وہ جسے Good out of Evil کہتے ہیں۔ اس کی رو سے مذکورہ اذیت بلکہ ''شر'' میں سے ہمیں بھی خیر کے کچھ پہلو ضرور ملے۔ میر درد نے کیا عمدہ شعر کہا ہے ؎

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

یہ درست کہ لمحۂ موجود میں ہم آزاد ہیں' اس ''سمناک'' ماحول سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے لیکن یہ بہت بڑا سچ ہے کہ اگر اس Misery کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوا ہوتا' زندگی کی سفاک جہتوں کے ہم خود شاہد نہ ہوتے تو ممکن ہے پرویز صاحب کی تصانیف میں موجود ''زندگی کے زہر'' کو نوشِ جاں کرنے کی صلاحیت سے عاری رہتے۔ وہی بات ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی' نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صاحبو! آپ ذرا سوچیئے وہ فرد جس نے چالیس برس مذہبی گھرانے' مذہبی معاشرے میں بتائے ہوں کیا وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی توڑ سکتا ہے؟ نہیں جناب یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرد کے طرزِ احساس کی بُنت میں مذہب کا Fibre بنیادی تانے بانے کے طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ اس فرد کے ساتھ پیش آ جائے کہ اسے ''بدنصیبی'' سے اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو خالص معروضیات کی دھوپ میں کھینچنا پڑ جائے' غیر جانبدار ہو کر ان کا جائزہ لینا پڑ جائے' ہر خوش عقیدگی کو منہا کر کے ان کا تجزیہ کرنا پڑ جائے

تو عین ممکن ہے نتائج کی بے رحم صورت دیکھ کر اس فرد کو ہارٹ اٹیک آ جائے اور وہ سچائی کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے۔

دوستو! یہ خاکسار عربی' فارسی' انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں' مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت سے قبل جسمانی طور پر مر جائے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت کے بعد جسمانی سطح پر زندہ رہے۔ کوئی اس عذاب کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

دفتری زندگی کے دوران ایک مرتبہ نہیں ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ زندگی بغیر کسی آراستگی کے' بغیر کسی ورق کے' ہر Drapery سے مکمل بے نیاز سامنے آتی رہی۔ ایسے لمحے بار بار آئے کہ غیبی قوتوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی' لیکن یہ کیا کہ Stretch the Truth والا فارمولا بلکہ مجرب نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا' پر ہوا کچھ نہیں' جو زمینی حقائق تھے' وہ جوں کے توں رہے' جو سچ تھا' وہ وہی رہا۔ اسباب کا جادو ہی سر چڑھ کے بولا' علت اور معلول کے بیچ رشتے کی توانائی اس شدت سے ابھر کر سامنے آئی کہ I was Stumped.

طاقچے کے خطوط پڑھتے پڑھاتے عمر بیت گئی تھی' کچھ پلے نہیں پڑا تھا' یہ پرویز ہی تھا جس نے اقبال کے یہ شعر یوں سمجھائے کہ ہمیں ''کلیات اقبال'' میں انہیں اس نیت سے تلاش کرنا پڑا' کہیں یہ اشعار پرویز نے خود گھڑ کر تو اقبال سے منسوب نہیں کر دیئے' آپ بھی سنئے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جی ہاں صاحبو! یہ پرویز صاحب کی ''کتاب التقدیر'' تھی جس کے بالاستعیاب مطالعہ نے وہ گرہ کھول دی جو ذہن میں بیس برس سے پڑی ہوئی تھی' کس کس نکتہ ور کی بارگاہ میں ناصیہ فرسائی نہیں کی تھی ہر کہیں سے ایک سا ہی جواب موصول ہوا تھا۔ ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔ اس معرکہ آرا کتاب کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے تو اپنے اللہ سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی کہ یارب الارباب! اس عاصی کو معاف کر دے کہ اب تک اپنا ہر جرم تیرے کھاتے میں ڈالتا آیا ہوں۔ تیرے قادر ہونے کا مفہوم اصفیاء و علماء نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ گناہ کی توفیق بھی تو دیتا ہے' نیکی کی سعادت بھی تو ہی بخشتا ہے۔ گمراہ بھی تو کرتا ہے' ہدایت کے جادے پر بھی تو ہی گامزن کرتا ہے۔ بندہ مجبور ہے' تیرے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے' مختاری کی تہمت سے متہم .....لیکن یہ پرویز تھا جس نے قرآن کھول کر دکھایا کہ نہیں نہیں یہ پاک خدا پر الزام ہے' اس نے تو ہر انسان کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے اور پھر اس نے وہ آیات ایک ایک کر کے سمجھائیں جن میں تضاد محسوس ہوتا تھا' جو خدا کو غیر عادل ثابت کرتی تھیں' بے انصاف بتاتی تھیں۔ بندے کو مجبور صورت میں پیش کرتی تھیں۔ جب سارے عقدے کھل گئے تو زبان اپنے آپ یہ تلاوت کرنے لگی: ؎

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں تھے

ضمناً پرویز صاحب نے ہی وضاحت کی' قرآن مجید کی کوئی آیت تو دور کی بات ہے' ایک نقطہ' شعشہ تک بھی منسوخ نہیں۔ ورنہ بڑے بڑے زہاد پانچ سات آیتوں کے سامنے دم بخود یہ اقرار کرتے پائے گئے: اے آیتو! تم پر تو عمل نہیں ہوسکتا۔

سبحان اللہ یہ کریڈٹ اس پرویز کے کھاتے میں ہی لکھا جائے گا جسے سارے علماء صبح وشام کافر کافر کہتے نہیں تھکتے۔ آپ یقین کیجئے مسئلہ تقدیر سمجھ میں آنے کے بعد اس عاجز کو وہی لذت محسوس ہوئی جو پوری تحقیق کے بعد کسی نومسلم کو قبول اسلام کی ملکوتی ساعت میں محسوس ہوتی ہوگی۔

غلام احمد پرویز کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ختم نبوت کا حقیقی مفہوم سمجھا یا تفصیل پھر کبھی سہی' اجمالاً اتنا عرض ہے کہ احمدیوں کے ساتھ ہمارا بڑا اوقت گزرا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو مجموعی طور پر اچھے کردار والے انسان پایا ہے' شرافت اور علم تقریباً ہر احمدی کے امتیازی اوصاف ہیں کہ ان کی جماعت منظّم ہے' تربیتی نظام مثالی ہے لیکن ان لوگوں کے اعتقادات ریت کی دیوار ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کیوں معروضی بنیادوں پر اپنا جائزہ نہیں لیتے؟ ہم اپنے طور پر اس کی دو وجوہ تلاش کر سکے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے علماء نے اس جماعت کے خلاف نفرت کی ایسی فضا تیار کی ہے کہ یہ لوگ اپنے کمزور عقیدوں کے ساتھ اور زیادہ مضبوطی سے جڑ گئے ہیں۔ اگر انہیں پیار کے ساتھ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتائج یکسر مختلف ہوتے۔ دوسری بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ختم نبوت کے باب میں عام مسلمانوں کا قریب قریب وہی موقف ہے جو خود قادیانیوں کا ہے۔ جی ہاں ایک آنے والے کا عقیدہ مسلمانوں کی میراث ہے۔ ''ہم نے احمدی علماء VS علمائے اسلام'' کافی مناظرے سنے ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ عام سے احمدی نے بھی اچھے بھلے عالم دین کو وہ عبارات دکھا کر لاجواب کر دیا جن میں غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو ہمارے اکابرین نے تسلیم کیا ہے۔ اب یہ اکابرین عامی شامی نہیں' جید ہستیاں ہیں۔ اس نازک صورتحال میں علماء کرام اسی معروف تاویل کا سہارا لیتے ہیں کہ غیر تشریعی نبی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے وہ چونکہ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں' آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے لئے تشریف لائیں گے۔ اس پر ذہین احمدی فوراً یوں گرفت کرتے ہیں۔ جناب! اصل چیز پھر ''ضرورت نبوت'' ہوئی۔ اگر تجدید واحیائے دین کے لئے پرانا نبی آسکتا ہے تو نیا کیوں نہیں؟ اور پھر وہ نیا جو قرآن کو منسوخ کرنے والا نہ ہو' حضور ﷺ کا امتی ہو۔ نیز ختم نبوت کے پھر معانی یہی ہوئے کہ حضور ﷺ فضیلت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ نبی ہیں' آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی پیروی میں کوئی نبی مبعوث ہو جائے تو آپ ﷺ کی ختمیت مرتبی متاثر نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی کے بعد متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اور مسلم شریف کی احادیث کے مطابق ان پر وحی بھی اترے گی۔

دوستو! یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی' ختم نبوت کا مطلب ہے' حضورؐ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' پرانا نہ نیا۔ قرآن بار بار شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام بھی اسی طرح وفات پا چکے ہیں جس طرح تمام انبیاء کرام رحلت فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اب کسی کی آمد کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ختم نبوت کا مطلب

''ضرورتِ نبوت'' کا خاتمہ ہے۔ اب ہدایت کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے' کوئی نئی وحی نہیں' حتیٰ کہ کسی مترادف نام ومتبادل عنوان سے بھی اللہ کا کلام کسی بندے پر نازل نہیں ہوگا' کیونکہ اللہ کا کلام حجت ہوتا ہے' اب قرآن کے بعد جو اس حجت کو بیچ میں لائے گا' وہ امت کو ئی تقسیم سے دوچار کرے گا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر ذرا غور کیجئے کہ احمدیوں کا مسئلہ سلجھانا کتنا آسان تھا یہ لوگ وفات مسیحؑ کے پہلے ہی قائل ہیں۔ انہیں صرف خاتم النبین کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں بتایا جاتا کہ آیات روایات پر مقدم ہیں۔ جب آیات یہ اصولی فیصلہ دے رہی ہیں کہ نئی نبوت ممکن ہی نہیں تو آپ اس فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں' کسی اور طرف آپ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قول رسولؐ اور آیت ربانی میں تناقض ہو۔ جب اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں تو پھر حضور ﷺ کا نقطہ نظر اس سے ہٹ کر کیسے ہو سکتا ہے؟ نتیجہ معلوم! دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ از سرِ نو جائزہ لیا جائے وہ فرامین جو حضور ﷺ سے منسوب کئے جا رہے ہیں کیا وہ حضور ﷺ کے ارشادات ہیں بھی یا نہیں؟ پرویز صاحب نے ہی قوم کو سمجھایا کہ حدیث رسولؐ رہنمائی کا بلاشبہ سرچشمہ ہے لیکن یہ طے ہونا از بس ناگزیر ہے کہ جسے حدیث رسولؐ کہا جا رہا ہے وہ حدیث رسولؐ ہے بھی یا نہیں؟ اور ساتھ ہی انہوں نے بہترین معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ جو قول قرآن کے مطابق ہے وہ قول رسولؐ ہے جو اس کے برعکس ہے وہ قول رسولؐ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تناظر میں پرویز کو منکر حدیث کہنا سراسر ناانصافی ہے یا نہیں؟

غلام احمد پرویز کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ بھی کئی جلدوں کی کتاب میں لیا جا سکتا ہے۔ وقت آئے گا ان پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں تحقیقی مقالے لکھوائیں گی' تب امت مسلمہ کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا شخص ان میں ہو گزرا ہے۔ ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے عمر بھر عجز وانکسار کی ردا اوڑھے رکھی اور یہی کہتے رہے کہ میں قرآن کا معمولی طالب علم ہوں' جس طرح مجھے سمجھ آئی' خلوصِ نیت سے اسی طرح آگے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ اتنا اہم علمی خزینہ تخلیق کرنے والے پرویز نے کسی فرقے کی بنا نہیں رکھی۔ ان کی جماعت وہی تھی جو رسول کریم ﷺ کی جماعت تھی۔ ظاہر ہے اللہ کے نبی نے اپنی امت کو فرقوں میں بانٹنا تو درکنار دیکھنا بھی پسند نہیں کیا' اسی لئے پرویز صاحب نے بھی علامہ اقبال کی طرح بس ایک فکر دی ہے' اب اس نابغہ عصر کی فکر سے پوری کی پوری امت کتنا نور کشید کرتی ہے' یہ اس پر منحصر ہے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک قرآن مجید کی شرح اپنی ضخیم تصانیف میں محفوظ کر دی ہے۔ جو ایک مربوط نظام فکر سے بجا طور پر معنون کی جا سکتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ روشنی کے اس مینار سے استفادہ کرتے ہوئے اس قرآنی معاشرے کی تشکیل کریں جس میں مسرتیں ہوں' بدعنوانیاں نہ ہوں' محبتیں ہوں' خوشحالیاں ہوں' انسانی ذوات نشوونما پائیں' امن ہو' فساد نہ ہو' افلاس کا عذاب نہ ہو۔ سب اپنے سوہنے اللہ کے قوانین کی اطاعت کریں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا ہی پیار کریں جتنا ان کی خوبصورت ذات سے ان کے دوستوں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر مخلص احباب رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو تھا۔

☆.....☆.....☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

ق ص ص

قَصَّ اَثَرَہٗ یَقص قصا و قصصا ۔ کسی کے پیچھے پیچھے اس کے نقوش قدم پر چلنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں دیکھئے (۶۴/۱۸، ۱۱/۲۸)۔

قص علیہ الخبر قصصا ۔ اسے وہ خبر بتادی۔ اسے اس پر مطلع کردیا۔ قرآن کریم میں ہے۔ **نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ** (12:3)۔ ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں۔ **القصاص** ۔ قصہ گو۔ ایک حدیث میں ہے ان بنی اسرائیل لما قصوا ھلکوا۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ہلاک ہوگئے۔ یا جب انہوں نے (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کردیا تو ہلاک ہوگئے۔ (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا)۔ **القصة**. معاملہ۔ خبر۔ واقعہ ۔

قص الشعر ۔ اس نے بال کاٹے۔ **المقص** ۔ قینچی کو کہتے ہیں۔

القصاص ۔ مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے دینا۔ قانون عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا۔ راغب نے اس کے معنی خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ) کا آنا کئے ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق ہم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے کہہ دیا کہ **من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا** ۔ جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا، بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا۔ **وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا** (5:32)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچالیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو موت سے بچایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جرم ہے۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کردے، یا ملک میں فساد برپا کردے، اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔

فساد فی الارض (بغاوت) کے متعلق (5:33) میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ہم اس سے آگے بڑھ کر انفرادی قتل کے جرم کی طرف آتے ہیں۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى** (2:178)۔ ''تم پر

مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے''۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' قصاص کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ہیں۔ لہٰذا قصاص کا مطلب ہوا مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا۔ اسے ایسے ہی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے۔ اس آیت میں خطاب یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں' اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالا دست ہو تو پھر صبر شکر کر کے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ''قابل دست اندازی پولیس'' قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs.....)۔ لہٰذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کر کے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ط۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو' بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُر) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُر) کو قتل کیا جائے' خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے' خواہ قاتل' مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے یہاں عام اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے' جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ط ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ط۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اسے چاہئے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے۔ ''کچھ معاف کر دینا''۔ (شی) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق

سزائے موت سے نہیں۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے ''کچھ معاف کر دینے'' (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ''کچھ معاف کر دینے'' کی شکل اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ سزا 'مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خوں بہا کہا جاتا ہے۔

جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیّتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے۔ ارشاد ہے **مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا** ۔ کسی مومن کے یہ شایان ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ **وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا** ''اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خوں بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے گا۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر' بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں' بلکہ خوں بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خوں بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے' مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں۔ لہٰذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو **فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ** کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خوں بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقی ماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہو گی (سزا اس صورت میں بھی خوں بہا ہی مقرر کی گئی ہے)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے **وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا** (4:53)۔ اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے' اور اس کی لعنت اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے''۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خوں بہا) نہیں ہے۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائے گی۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے۔ وہ غیرت میں آ کر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہو گی۔ جرم کی نوعیت اور احوال وظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہو گا۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں جزائوہ' جھنم کے بعد اللہ کا غضب۔ اس کی لعنت۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ مثلاً عبور دریائے شور۔ قید تنہائی۔ قید بامشقت۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم (Disqualify) کر دینا (لعنت کے یہی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں)۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم' موت (قتل) ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے **وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ** ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اسے قتل مت کرو۔ بجز اس کے کہ انصاف کا

تقاضا ایسا ہو۔ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں' اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں' مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسے اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہئے۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو ''سلطان'' بنایا ہے۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ ہوگا۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (17:33) ۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ط ۔ مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ (ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ''اسراف فی القتل'' ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے افراد متعلقہ کے لئے نہیں۔ قتل کا جرم' معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے۔ انفرادی جرم نہیں۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہو گی۔ مستغیث خود حکومت ہوگی۔ لہٰذا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ط کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔

(۱) وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ قتل خطا میں قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا۔ جس شخص سے محض سہواً' نادانستہ' بھول چوک میں' غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے۔ لہٰذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

(۲) معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ معاشرہ کا پورا غلبہ واقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا' اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار رہے گا۔

(۳) قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے۔ اور ''اللہ کا غضب ولعنت اور عذاب عظیم'' وغیرہ اس کے ساتھ' یا اس سے الگ' یا اس سے نچلے درجہ پر' دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے:

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل' افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہٰذا' مجرم کا پیچھا کر کے اسے سزا دینا' مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل بلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خوں بہا (دیت) ہوگی۔ اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کر دیں یا خوں بہا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ ''کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔ مگر غلطی سے''۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے' قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن کسے باشد' ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (5:32)۔ اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کر دے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خوں بہا ادا کرنا ہوگا تا کہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی قدر و قیمت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جا سکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو' یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر' یا دشمن سے جنگ میں' یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے' وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ افراد از خود) کہ بالحق کسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مقتول مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کر دیں۔ یہ ہے وہ قصاص جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (2:179)۔

☆.....☆.....☆

محترم نمائندگانِ بزم و قارئینِ طلوعِ اسلام

یاد دہانی کے لئے عرض گذار ہیں کہ آپ اپنے اور جن احباب کے نام رسالہ طلوعِ اسلام برائے سال 2015ء جاری رکھنا چاہتے ہیں ادارہ کو مورخہ 15 فروری 2015ء تک مطلع فرما دیں۔ تا کہ سال 2015ء کے لئے ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء کر دیا جائے۔ جو میگزین بند کرانا چاہتے ہیں ان کی تفصیل سے بھی بروقت آگاہ فرما دیں۔ (ادارہ طلوع اسلام)

ڈاکٹر انعام الحق

مومنین کی قرآن میں دی گئی ایک نمایاں نشانی

ادارہ کے سابق چیئرمین محترم ڈاکٹر انعام الحق صاحب نے اپنی بھابھی کے انتقال پر قرآن کی روشنی میں تجزیہ کر کے اپنی فیملی کو پیغام پہنچایا ہے جس کی ایک کاپی ادارہ کو بھی موصول ہوئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک قابلِ مثال روش ہے اس لئے یہ تحریر من وعن ذیل میں درج کی جارہی ہے۔ (مدیر)

آج میری بھابی سعیدہ ریاض اور خالہ زاد بہن علی الصبح نیند ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ وہ اپنی والدہ کی اکلوتی بچی تھیں اس لئے اُن کی والدہ اور میری خالہ نے بچپن ہی میں مجھے اپنا بیٹا ڈیکلیر کیا ہوا تھا۔ اس رشتہ کے ناطے سے وہ میری بڑی بہن کی حیثیت رکھتی اور سمجھتی بھی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں مختلف مواقع پر اُن کے ہاں بطور گھر کے ممبر کی حیثیت سے رہائش پذیر ہونے کا شرف حاصل کرتا رہا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں میں سال سے بھی زائد زمانہ تک اُنہی کے گھر رہتا رہا جب میں اپنی پڑھائی مکمل کر رہا تھا تو اس تمام عرصہ میں اُنہوں نے خانساماں کو ہدایات دی ہوئی تھیں کہ گھر کے سبھی افراد سے پہلے کھانے میں میری ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ اور اس تمام عرصہ میں اُنہوں نے خود نگرانی کرتے ہوئے کسی کے لئے کوتاہی برتنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑ رکھی تھی۔

اب جب میں قرآن کی درجِ ذیل آیت میں مومنین کی سب سے نمایاں نشانی یہ پاتا ہوں تو میرے سامنے اُنہی کا چہرہ آجاتا ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ

''وہ (مومنین) اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے ہیں چاہے اس میں اُن کو خود تنگی کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے''۔

اب اگر دوسرا ضرورت مند یتیم اور قریبی بھی ہو تو وہ قرآن کی عین ترجیح کی مطابقت میں حسنِ سلوک کا اوّل حق رکھتا ہے۔

میں ہمیشہ اُن کی خواہش اور مشورہ پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا جب وہ مجھ سے بطور بھائی اور قرآن کا سکالر ہونے کے ناطے اپنے سلوک کو عدل میں رہتے ہوئے سرانجام دینے میں مجھ سے رائے طلب کرتی رہتی۔ باجی کی ذات تو اِس عمر میں بھی ہمارے لئے ایک قابلِ اعتماد سہارا ہستی کا درجہ رکھتی تھیں۔ ہم اب کیا کہہ سکتے ہیں ماسوا اس کے کہ

"We will miss you and miss you desperately."

☆.....☆.....☆

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

حقیقی جمہوریت کے لئے انتخابی اصلاحات (چند تجاویز)

جمہوریت:۔ دنیا کا بہترین سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام قرآنِ کریم میں موجود ہے مگر اور تو اور خود مسلمان، دعووں کے باوجود، عملاً اسے اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے پر تیار نہیں۔ سیاسی لحاظ سے دوسرے نمبر پر ''جمہوریت'' کو ایک اچھا نظام کہا جاسکتا ہے، لیکن اس کا نفاذ بھی ہم اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں جو اکثر اوقات برائے نام ''جمہوری'' ہوتا ہے۔ جمہوری نظام کے قیام کے لئے انتخابات ضروری ہیں۔ انتخابات کے ذریعے قوم کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں انتخابات کا وہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس میں مفاد پرست لوگ فتح حاصل کرسکیں۔ مثلاً متناسب نمائندگی کا اصول جمہوریت کی روح کے قریب ہے مگر اسے مسترد کرکے سادہ اکثریت کی بنیاد پر نمائندگی کا طریق اختیار کیا جاتا ہے جس سے انچاس (49) فیصد ووٹرز کی رائے ضائع ہوجاتی ہے۔

پاکستان میں (بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں) غریب، کمزور اور محروم لوگوں کی اکثریت ہے۔ حکومت کرنا بھی اسی اکثریت کا حق ہے مگر عملاً کوئی غریب آدمی اسمبلی کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتا، چہ جائیکہ وہ اسمبلی کا ممبر منتخب ہوسکے۔ پاکستان میں انتخابات، دولت یا بدمعاشی (یا دونوں) کے بل بوتے پر جیتنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس صورت میں پسے ہوئے طبقات کا کوئی فرد اسمبلی کا ممبر کیسے بن سکتا ہے؟۔ ان حالات میں تعلیم، قابلیت، اہلیت یا حسنِ کردار کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس طرح جو لوگ اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں، وہ تمام اصول وضوابط اور قوانین اپنے مفادات کے لئے بناتے ہیں۔ ماضی کی برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن کے مطابق: ''قانون صرف امراء کا خصوصی استحقاق ہے اور غریبوں کے لئے اس میں کوئی اعانت موجود نہیں ہے۔'' (Law is the prerogative of the rich and of no assistance to the poor)۔ پارلیمنٹ میں صرف امراء ہی پہنچ سکتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کے خلاف اور پسے ہوئے طبقات کے فائدے کیلئے نہ قانون سازی کرتے ہیں اور نہ کسی قانون کو اپنے مفادات کے خلاف استعمال ہونے دیتے ہیں۔ غریب، کمزور اور محروم انسان ہمیشہ ایک ہی کولہو میں جتا رہتا ہے، اور زندگی کی مشقتوں سے باہر کبھی نہیں نکل پاتا۔ امیر آدمی ہمیشہ ننانوے اور غریب آدمی ہمیشہ دال روٹی کے چکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ امیر آدمی دولت اور بدمعاشی کے بل بوتے پر اسمبلی کا ممبر بن کر اور قانون کو اپنی لونڈی بنا کر اپنے چکر میں کامیاب جبکہ غریب آدمی قانون کی طرف سے اعانت نہ ملنے کے سبب تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔

جمہوریت کا سادہ سا مطلب ہے ''اکثریت کی حکومت''۔ اگر جمہوریت کا یہی مطلب ہے تو پاکستان میں اکثریت تو غریبوں کی ہے لیکن اسمبلیوں میں ایک بھی غریب ممبر اسمبلی نظر نہیں آتا۔ پھر یہ کیسی جمہوریت ہے؟۔ اگر جمہوریت ہی کو نظامِ حکومت تسلیم کرنا ہے تو

پھر اس میں اصلاحات کر کے اسے ''حقیقی جمہوریت'' بنانا ہوگا۔ آج قوم اس امر پر متفق ہے کہ اسمبلیوں کے لئے انتخابات کے طریقِ کار میں اصلاحات کر کے انہیں حقیقی معانی میں قوم کے لئے فائدہ بخش بنایا جائے۔ اس معاملے میں کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں:۔

انتخابات:۔ آئینِ پاکستان ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل نمبر ۲۲۷ کے تحت پاکستان میں کوئی قانون (قاعدہ یا ضابطہ) قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا۔ انتخاب امیر کا ہو یا ارکانِ مجلسِ مشاورت (پارلیمان) کا، اس سلسلے میں قرآن کریم نے کوئی پابندی نہیں لگائی یا خود ہی کوئی طریقِ انتخاب نہیں بتایا۔ اسے اُمت پر چھوڑ دیا کہ وہ خود ہی اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، باہمی مشاورت سے، جو طریق مناسب سمجھے، اسے اختیار کر لے، البتہ وہ طریق قرآن سے کسی بھی طرح متصادم نہ ہو۔ پرویز صاحب نے راقم کے خط کا جواب دیتے ہوئے اکتوبر ۱۹۷۹ء کے طلوعِ اسلام میں (صفحہ نمبر ۲۰ پر) لکھا کہ:۔ ''جہاں تک انتخاب یا حکومت کے کسی اور طریقِ کار کا تعلق ہے اس باب میں ایک اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن مجید نے جن امور کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور ابدی قرار دینا منشائے خداوندی نہیں تھا۔ اس نے اصول اور حدود متعین کر دیئے اور اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے۔ یہ حدود اور اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کی جزئیات اور انہیں روبہ عمل لانے کا طریقِ کار ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بدلتا رہے گا۔''

انتخابِ امیر:۔ پرویز صاحب نے منصبِ امارت کے لئے انتخاب کے معاملے میں اپنی کتاب سیرتِ رسول کریم ﷺ ''معراجِ انسانیت'' میں لکھا ہے کہ:۔ ''اس نظام میں سب سے اہم مقام امیرِ ملت کا ہوگا۔ رسول مامور من اللہ تھا، اس لئے اُس کی امارت و امامتِ کبریٰ لوگوں کی رہینِ منت نہ تھی۔ وہ بحیثیت رسول، امیرِ ملت اور مرکزِ ملت تھا۔ لیکن اُس کے بعد یہ حیثیت تو کسی کو حاصل نہ ہوگی۔۔۔ اب اُمت میں کوئی رسول نہیں ہوگا، اس لئے اب ملت اپنا ''امام'' خود منتخب کرے گی اور معیارِ انتخاب تقویٰ ہوگا، کہ '' اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ '' خدا کا مقرر کردہ معیار ہے۔ اب یہ امام رسول کا جانشین (خلیفۃ الرسول) ہوگا۔ اور اس کی اطاعت بمنزلہ ''اللہ ورسول کی اطاعت'' کے ہوگی۔ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ''اللہ ورسول'' سے مراد ہی مرکزِ ملت ہے۔ اب احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ اس کا فریضہ ہوگا۔ اور ان احکام کی اطاعت اس کی وساطت سے ہوگی (واضح رہے کہ ''مرکزِ ملت'' کے متعلق یہ ضروری نہیں کہ تمام اختیارات ایک فرد کے سپرد کر دیئے جائیں۔ اُمت کے مشورہ سے، یہ اختیارات، ایک فرد کی بجائے، ایک جماعت کے بھی سپرد کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظامی امور ہیں جن کا فیصلہ ہر زمانے کے مسلمان، اپنی اپنی مصلحتوں کے مطابق خود کر سکتے ہیں۔۔۔ اس میں غیر متبدل شرط یہ ہے کہ اس مرکز کے فیصلے، حدودِ خداوندی سے کسی بھی صورت میں نہ ٹکرائیں۔ بلکہ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کئے جائیں۔ اور جن کے سپرد یہ کام کئے جائیں وہ خود قوانینِ خداوندی کے سب سے زیادہ پابند ہوں)۔ وہ (امیر) سب سے پہلے خود ''مسلم'' (ان فیصلوں کو تسلیم کرنے والا) اور عبدِ مومن (خدا کا تابع بندہ) ہونے کی حیثیت سے ان احکامات پر خود عمل پیرا ہوگا۔ اور اس کے بعد دوسروں سے اس کی پیروی کرائے گا۔''

بیعت:۔ اسلامی نظامِ حکومت میں انتخابِ امیر اور بیعت واطاعتِ امیر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سب کچھ اُمت کی مشاورت

سے طے پائے گا۔۔اس سلسلے میں بیعت کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ پرویز صاحب ''شاہکارِ رسالت'' کے تیسرے باب ''خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است'' میں ''حضرت عمرؓ کا انتخاب'' اور ''بیعت کا مفہوم'' کے ذیلی عنوانات کے تحت لکھتے ہیں:۔ ''دین کے نظام میں بیعت کی اصطلاح بڑی بنیادی، فلہٰذا اس قابل ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ قرآن کریم کی رو سے، جب کوئی شخص اُمتِ مسلمہ (کی سوسائٹی) کا رکن بننا چاہے (یعنی عام اصطلاح میں مسلمان ہونا چاہے)، تو اسے، اپنی کامل رضامندی سے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کی رو سے اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ (9:111)۔ وہ شخص ''اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض خدا اسے جنت کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔'' (اس دنیا کی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی)۔۔۔ یہاں سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو ایک ان دیکھی غیر محسوس حقیقت ہے، اس کے ساتھ بیع وشریٰ (خرید وفروخت) کا یہ معاملہ طے کس طرح پاتا ہے؟۔ اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے دیا جا چکا ہے کہ یہ معاملہ طے پاتا ہے اُس سربراہِ مملکت کے توسط سے جو احکامِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم کرتا ہے۔۔ اصولاً یوں سمجھ لیجئے کہ انسانوں کے معاملہ میں جس قدر ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لی ہیں (اور جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے)، وہ اسلامی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ جو مملکت، خدا کی یہ ذمہ داریاں پوری کرتی ہے، اسی کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔۔۔ اس اصول کے مطابق، خدا سے بیع وشریٰ (یعنی حقوق اور ذمہ داریوں) کا یہ معاملہ سربراہِ مملکت کی وساطت سے طے پاتا ہے۔۔۔ اس کی شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ جب صلح حدیبیہ سے پہلے، جماعتِ مومنین پر سخت نازک وقت آیا جس میں نظر آتا تھا کہ اہلِ مکّہ کے ساتھ شدید مقابلہ ہوگا اور اس میں انہیں بے دریغ جانیں قربان کرنی پڑیں گی، تو حضور ﷺ نے، بیع وشریٰ کے معاملہ کی تجدید یا یاددہانی کے طور پر، جماعتِ مومنین سے ''بیعت'' لی۔ (بیعت کے معنی ہی خود فروشی، یعنی اپنے آپ کو بیچ ڈالنا ہیں)۔۔۔ اس مقصد کے لئے صحابہؓ آتے اور (اس زمانے کے قاعدے کے مطابق) اس معاہدہ کے لئے اپنا ہاتھ حضور ﷺ کی طرف بڑھاتے اور حضور ﷺ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر، معاہدہ کی توثیق فرماتے تھے۔ اس ''بیعت'' کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ ۔۔۔ یہ لوگ جو (اے رسول ﷺ) تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں:۔ انما یبایعون اللہ۔ یہ درحقیقت خدا کے ساتھ اپنی بیع کا معاملہ طے کرتے ہیں۔۔۔ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ ۚ (48:10)۔ ان کے ہاتھ پر، نظر بظاہر محسوس طور پر، تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن در حقیقت یہ خدا کا ہاتھ ہے، تو ان سے یہ معاہدہ خدا کے (Behalf) پر کرتا ہے۔ (یہ تھا قرآن کریم کی رو سے ''بیعت'' کا مفہوم۔ لیکن جب ''دین'' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس ''بیعت'' کا مفہوم رہ گیا کسی پیر کا مرید بن جانا اور اس کے لئے ''حضرت صاحب کی بیعت'' کر لینا۔ سچ ہے:۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں، لیکن ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

(اقبال)

اصولِ اہلیت:۔ ''اگر مشاورتی مشینری کا طریق انتخابی ہوگا تو امیدواروں کو انتخابی مہم کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی۔ ان کا ذاتی کردار اور ماضی کی زندگی ان کے لئے معیارِ انتخاب ہوگا۔ قوم اس کا موازنہ خود کرلے گی۔'' (طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۷ء۔ صفحہ نمبر ۱۳)۔ ۱۹۷۹ء میں جب طلوعِ اسلام سے استفسار کیا گیا کہ ووٹ کس کو دیا جائے تو طلوعِ اسلام کا جواب ایسا تھا جس سے اسلام میں اصولِ اہلیت واضح ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''یہ واضح ہے کہ ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے، نہ ہماری اپنی کوئی سیاسی پارٹی ہے، نہ ہم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر بزمِ طلوعِ اسلام کا کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہے تو اسے بزم کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ بزم کا رکن البتہ اپنی ذاتی حیثیت سے آزاد امیدوار کے طور پر اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا ہوسکتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس اسمبلی میں کوئی مسئلہ ایسا سامنے آئے گا جو قرآن مجید کے خلاف ہوگا تو وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ جہاں تک ووٹ دینے کا تعلق ہے، قرآنی راہنمائی کی وضاحت ہمارا فریضہ ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ اس شخص کو ووٹ دیں جس کی صداقت، شرافت، امانت، دیانت، اور اہلیت پر آپ کو پورا پورا بھروسہ ہو۔ ایسے شخص کے تولنے اور ماپنے کے لئے قرآن کریم نے ایک ایسا پیمانہ عطا کر دیا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا۔ جب نبی اکرم ﷺ سے آپ کے مخالفین نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16)۔ ''میں کوئی اجنبی یا نووارد نہیں۔ میں نے اس سے پہلے اپنی پوری عمر تم میں بسر کی ہے۔ کیا تم اس پر غور کر کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟'' اس آیت میں ''من قبلہٖ'' کا ٹکڑا بڑا بنیادی ہے۔ جب کوئی شخص کسی منصب کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اپنی وضع بڑی مقدس بنالیتا ہے لیکن اس کا صحیح کیریکٹر اس کی اس زمانے کی زندگی سے سامنے آسکتا ہے جب وہ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ ہے صحیح پیمانہ۔ جو شخص بطور امیدوار کھڑا ہو آپ یہ دیکھئے کہ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی گزری ہے۔۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ کا وہ معیار بھی شامل کر لیجئے کہ آپ نے کسی شخص سے کہا کہ وہ اپنے دعوے کی تائید کے لئے کسی ایسے شخص کو لائے جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک شخص کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا: کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے۔۔ اس نے کہا، نہیں۔۔۔۔ پھر پوچھا۔۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو۔۔ اس نے کہا، نہیں۔۔۔۔ آپ نے پھر پوچھا۔۔ کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے۔ جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں تو آپ نے فرمایا کہ پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ لہٰذا، کسی امیدوار کے قابلِ اعتماد ہونے کا فاروقی معیار بھی پیشِ نظر رکھئے۔''

پاکیزگیٔ کردار:۔ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۷۷ء۔ ص۔ ۱۷۔۱۶): ۔۔ پرویز صاحب اصولِ اہلیت کے بارے میں رقمطراز ہیں۔۔ ''ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ..... (4:58)۔ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو اختیارات تمہیں بطور امانت دیئے گئے ہیں، انہیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔'' اس ''اہلیت'' میں علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے کیونکہ قرآن کی رو سے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (49:13)۔ تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت

کرتا ہے۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوں اور اپنے ہی جذبات و خیالات کے پیچھے لگ جائیں، ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سورہ کہف میں ہے: وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (18:28)۔ تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہو گیا، اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گزر گیا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ:۔ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (11:46)۔ جس کا عمل غیر صالح ہو جائے، وہ ''تمہارے اہل'' میں سے نہیں۔۔ لہٰذا، مملکت کے افسرانِ ماتحت سے لے کر صدارتِ عظمیٰ تک، اہلیت، صالحیت اور تقویٰ (پاکیزگیٔ سیرت) کی شرائط ہر ایک پر عائد ہوں گی اور معاشرہ میں مدارج، جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی رو سے متعین کئے جائیں گے۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19) ارشادِ خداوندی ہے۔''

عمالِ حکومت کا معیارِ انتخاب:۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۸۳ء۔ صفحہ نمبر ۲۸۔ ''حضرت عمرؓ اپنے ان جلیل القدر رفقاء کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے تھے۔ سب سے پہلے، خود اپنے آپ پر، اور اس کے بعد ان عمالِ حکومت پر۔ صدرِ اوّل کے اسلامی نظام نے جو اس قدر ابد درکنار درخشندہ و تابندہ و تابناک، انسانیت ساز، نتائج پیدا کئے تھے تو اس کی وجہ، قوانینِ حکومت کے مبنی برحق ہونے کے علاوہ، اعیان و ارکانِ حکومت کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار بھی تھی اور یہی وجہ تھی جو حضرت عمرؓ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ قرآن کریم چونکہ اس نظام کا نقطۂ پرکار تھا، اس لئے عمال کے انتخاب میں، قرآنی علوم کو بنیادی خصوصیت قرار دیا جاتا تھا۔'' آگے چل کر لکھا ہے کہ:۔ ''وہ یعنی حضرت عمرؓ کسی کے نماز روزے کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ منصبِ متعلقہ کے لئے اُس کی صلاحیت اور حسنِ معاملات کو دیکھتے تھے اور ان صلاحیتوں میں جو بھی سب سے آگے ہوتا، اُسے منتخب کرتے تھے۔ اور اس باب میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔۔۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ ''میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کر دوں جس سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا شخص موجود ہو۔'' آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سیادت (اعلیٰ منصب) کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرنا پسند کرتا ہوں کہ:۔ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو اپنی قوم کا سردار نظر آئے، اور جب اُسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔''

ثقاہت و قُوّت:۔ ''آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:۔ خدا خائن کی قوت اور ثقہ انسان کے عجز (کمزوری) سے بچائے۔ یعنی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک انسان اگر خائن ہے تو وہ بھی خطرناک ہے، اور ایک شخص نہایت دیانت دار اور قابلِ اعتماد ہے لیکن ہے کمزور تو وہ بھی مضرت رساں ہے۔ لہٰذا، انتخاب کا اصول تھا، ثقاہت اور قوت۔ لیکن ''قوت'' سے مراد سنگدلی اور شقاوتِ قلبی نہیں تھی، عدل کے لئے جراءت و بسالت تھی۔'' حضرت عمرؓ عہدے کے طلب گار، شاعروں، شخصیت پرستوں اور قریبی رشتے داروں کو عمال مقرر کرنے سے احتراز برتتے تھے۔ پرویز صاحب، ایک اسلامی حکومت کے عمال کے انتخاب کے معاملے میں حضرت عمرؓ کے ان معیارات کو راہنما اصول قرار دیتے ہیں۔

آمدنی کے اعتبار سے حلقہ ہائے انتخاب:۔ جناب پرویز صاحب مروجہ (مغربی) جمہوریت کو حقیقی جمہوریت نہیں مانتے۔ کیونکہ جمہوریت کے معنی ہیں جمہور (اکثریت) کی حکومت۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اکثریت کم آمدنی والے لوگوں یعنی

غریبوں کی ہے جبکہ کوئی غریب آدمی ہمارے ملک کے پارلیمان کا ممبر بننے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ زیادہ آمدنی والے لوگوں کی تعداد ہمارے ملک میں کم ہے مگر ہمارے پارلیمان کے ممبران ہمیشہ امراء ہی ہوتے ہیں جو کہ اقلیت میں ہیں اور یہ حقیقی جمہوریت کی صریحاً نفی ہے۔ یوں یہ اکثریت کی نہیں، اقلیت کی حکومت بن جاتی ہے۔ جناب پرویز صاحب شروع ہی سے یہ تجویز دیتے چلے آئے ہیں کہ اگر حقیقی اکثریت کی حکومت (یعنی حقیقی جمہوریت) قائم کرنا ہے تو پھر موجودہ نظامِ انتخابات میں اصلاحات ضروری ہیں۔ طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ نمبر ۱۳ ملاحظہ ہو: ''مسٹر بھٹو، اگر فی الواقعہ سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان ترین شکل وہ تجویز ہے جسے ہم نے دو سال پہلے پیش کیا تھا۔ یعنی آمدنی کی بنیاد پر انتخابات۔ سرمایہ بجائے خویش کوئی قوت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ سرمایہ دار اپنے سرمائے سے قوت خریدتا ہے، اور جمہوری اندازِ حکومت میں قوت کے معنی ہوتے ہیں مجالسِ قوانین ساز میں موثر مقام کا حصول۔ انتخابات کے موجودہ نظام کی رو سے ان مجالس میں نشستیں روپے کے زور سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہماری پیش کردہ تجویز کی رو سے شکل یہ ہوگی کہ مثلاً ملک میں جتنے لوگوں کی آمدنی ایک سو روپیہ ماہوار تک ہو، انہیں ایک وحدت تصور کر لیا جائے اور ان کی آبادی کی نسبت سے اس حلقے کی نشستیں مقرر کی جائیں۔ اس میں ووٹرز بھی اسی آمدنی کے مالک ہوں اور امیدوار بھی (کم از کم تعلیم کی شرط کے ساتھ)۔ اسی طرح آمدنیوں کو بڑھا کر حلقے قائم کرتے چلے جائیں۔ جوں جوں حلقہ اوپر اٹھے گا، اس میں نشستوں کی تعداد کم ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ سب سے اونچے ۔۔۔ بائیس خاندانوں پر مشتمل ۔۔۔ حلقے کے حصے میں شاید ایک نشست بھی نہ آسکے ۔۔۔ اس طرح مجالسِ قوانین ساز میں موثر حیثیت سرمایہ داروں کی نہیں بلکہ کم سے کم آمدنی والے افراد کی ہو جائے گی۔ جب اس طرح سرمائے کی قوت ٹوٹ جائے گی تو سرمایہ داری میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی۔''

طلوعِ اسلام فروری ۱۹۷۳ء۔ ص۔ ۵۰: ''اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کئے جائیں۔ مثلاً سو روپے ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین ۔۔ اور اس کے بعد شرط یہ کہ اس حلقے سے امیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جایئے۔ مثلاً پانچ سو روپے ماہوار آمدنی والوں کا ایک حلقہء انتخاب اور امیدوار بھی انہی میں سے۔ اسے اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جایئے ۔۔۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے، نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔ اور آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے کا پورا ''ایوان'' قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہوگا۔

کم از کم تعلیم:۔ اس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لئے کم از کم تعلیم کی شرط بھی ضروری عائد ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔ سو روپے آمدنی والوں کے لئے پرائمری یا مڈل کی شرط بھی کافی ہے۔ جوں جوں اوپر اٹھتے جائیں تعلیمی معیار بھی بلند ہوتا جائے۔ صدارت کے لئے البتہ معیار آمدنی نہیں صرف تعلیم رکھا جائے ۔۔۔ اس طریقِ انتخاب کی رو سے (علاوہ اس کے کہ قوم کے نمائندے فی الواقعہ قوم کے نمائندے ہوں گے) سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی

خرابیاں (جن کا ہم اس قدر رونا روتے رہتے ہیں) خود بخود دور ہو جائیں گی۔ سو روپے ماہوار آمدنی والا امیدوار اپنے ووٹر کو رشوت کہاں سے دے گا۔ اور جھوٹے سچے پروپیگنڈے کے لئے رقم کہاں سے لائے گا؟۔ اور لاکھ روپے ماہوار آمدنی والا اگر رشوت دینا چاہے گا تو اس کے ووٹر بھی اسی کی حیثیت کے ہوں گے۔ انہیں خریدنے کے لئے اسے خود بکنا پڑے گا۔''

علمی معیار۔ ایک تجویز:۔ قرآن کریم نے اہلِ علم و تدبر (یعنی عقل سے کام لینے والوں) کا بڑا رتبہ بیان کیا ہے۔ اہلِ علم اور بے علم میں بینا اور نابینا کا فرق ہے۔ **قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ** (6:50)۔ **قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ** ''آپ ﷺ ان سے پوچھئے! کہ کیا جاننے والے (اہلِ علم) اور نہ جاننے والے (بے علم) برابر ہو سکتے ہیں۔'' (39:9)۔ حضور کریم ﷺ جیسی علمِ وحی کی حامل ہستی کو بھی اپنے علم میں مزید اضافہ کے لئے دعا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ **وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا** (20:114)۔ ظاہر ہے کہ قانون سازی جیسے اہم اور نازک مقصد کی تکمیل کے لئے اہلِ علم و تدبر اور اصحابِ شعور کو منتخب کرنا ہوگا۔ اسلام میں قانون سازی کے لئے ایسے افراد کا انتخاب ضروری ہے جو دین اور دنیا (قرآن کریم اور علومِ جدیدہ) دونوں کے بارے میں مناسب علم کے حامل ہوں۔ اور ان میں یہ اہلیت بھی ہو کہ وہ اپنے زمانے کے گوناگوں مسائل کا ادراک بھی رکھتے ہوں۔ نیز وہ قرآن کریم اور جدید علوم کی روشنی میں اُن مسائل کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

اس مقصد کے لئے موجودہ زمانے میں حاصل کردہ ڈگریوں اور سندات کی شرط رکھی تو جا سکتی ہے مگر اس شرط کو ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ہی تعلیمی سندات اور ڈگریاں لازمی طور پر اہلیت اور شعور کی جانچ کا کوئی حقیقی اور یقینی معیار ہیں۔ کیونکہ کسی کے شعور کے معیار کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے۔ شعور اور اصابتِ رائے یعنی اہلیت کی پیمائش کا کوئی حقیقی اور یقینی پیمانہ کسی کے پاس موجود نہیں۔ ایک ایم اے پاس کے مقابلہ میں ایک کم پڑھا لکھا زیادہ باشعور ہو سکتا ہے۔ شعور کا اندازہ صرف انسانی علم، قوت اور امکانات کی حد تک ہی ممکن ہے۔۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ امیدواروں کی اہلیت کی جانچ پڑتال کے لئے حلقہء انتخاب کے ریٹرننگ آفیسر کے ساتھ کم از کم دو مزید ججز کا ایک پینل مقرر کر دیا جائے جو مذکورہ بالا معیارات کو سامنے رکھ کر امیدواروں کی اہلیت کا فیصلہ کرے کہ وہ انتخاب میں حصہ لینے کی اہلیت کے حامل ہیں یا نہیں۔

جراءت کا کام:۔ حقیقی جمہوریت (غریب اور محروم طبقات کی اکثریت کی حکومت) کو قبول اور برداشت کرنا مفاد پرست طبقات کے لئے انتہائی مشکل ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے اس قسم کی تجاویز کو ناممکن العمل قرار دے کر مسترد کر دیں گے لیکن اگر دل میں انسانیت کے لئے حقیقی درد اور محبت، اور محروم لوگوں کی بدحالی اور کسمپرسی کا احساس ہو تو پسے ہوئے طبقات کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی سا بھی قدم اُٹھانا ناممکنات میں سے نہیں۔ البتہ یہ کام کسی مخلص، دیانتدار، قابل اور جراءت مند انسان کا ہے جو ایسی تجاویز کو منظور اور حقیقی معانی میں نافذ کر، اور کرا سکے۔ ہے کوئی ایسا مردِ مجاہد! ہے کوئی اللہ کا ایسا بندہ! جو جراءتِ ایمانی سے کام لے کر ایسا حقیقی جمہوری انقلاب برپا کر سکے؟۔

☆.....☆.....☆

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

نویں قسط

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

نفسیات کے علم کا تعلق بنیادی اعتبار سے انسانی شخصیت کے مطالعے، تجزیے اور تعبیر سے ہے۔ جس میں انسان کی شخصیت کے مختلف تعینات مثلاً اوصاف، رجحانات، میلانِ طبع، اقدار و رویّے اور شخصیت کی نشوونما وغیرہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ انسان کے عصبی نظام اور اس کے اندرونی ذہنی عوامل میں تبدیلی کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس لئے نفسیات کے علم میں بھی دیگر انسانی علوم کی طرح ترقی اور ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے۔ ارتقاء کے اس دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب علم کا دائرہ کار اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف شعبوں یا شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس طرح جو علم وجود میں آتا ہے، اسے جاننے کے لئے مخصوص تربیت اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب کسی ایک شخص کے لئے اس علم کے سارے پہلوؤں اور اس پر کی گئی تحقیقات کے بارے میں تفصیلی علم حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس وقت، ایسے ماہرین وجود میں آجاتے ہیں جو اس علم کی کسی مخصوص شاخ کے بارے میں دوسرے افراد سے زیادہ اور تفصیلی معلومات رکھتے ہیں۔ ایسے افراد ماہر خصوصی (Specialists) کہلاتے ہیں۔ علم نفسیات کی ترقی اور فروغ کے لئے بھی ایسے ماہرین سامنے آئے جنہوں نے نہ صرف نفسیات کی بنیادوں کو مستحکم کیا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ماہرین نفسیات میں بلاشبہ سب سے پہلا نام سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) (1939ء، 1856ء) کا ہے۔ وہ چیکوسلاواکیہ میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ غریب تھا اور اون کا کاروبار کرتا تھا۔ پہلی شادی سے اس کے دو بیٹے تھے۔ فرائڈ کی ماں جس کی عمر فرائڈ کی پیدائش کے وقت صرف اکیس سال تھی، اپنے سوتیلے بیٹوں سے چھوٹی تھی۔ شہزاد احمد کہتے ہیں کہ بہت کم لوگ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کس طرح کی خاندانی صورت حال ہو سکتی ہے؟ اور اس کا رشتہ کس طرح ایڈی پس کامپلیکس (Oedipus Comples) کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ (ایڈی پس پر بعد میں روشنی ڈالی جائے گی) بہرحال فرائڈ کی بنیادی نفسیات کا تعلق، والدین کے ساتھ قائم ہونے والے تعلقات سے بہت گہرا ہے اور ذہنی صحت اور بیماری کی کلید بھی یہی ہے۔ بعد میں فرائڈ نے اپنے خاندان کی تاریخ کو اپنی نفسیاتی پیش قدمی میں ایک اہم عنصر قرار دیا تھا۔ فرائڈ کے عہد طفولیت میں ہی اس کا خاندان ہجرت کر کے ویانا آ گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری لی تھی۔ موسیقی اور فون سے سخت نفرت تھی۔ مرد کو افضل اور عورت کو اس کا

تابع سمجھتا تھا جس کا مقصد مرد کو راحت اور سکون پہنچانا ہے۔ اس وقت یورپ میں یہودیوں کے خلاف زور شور سے مہم شروع تھی اس لئے اس امر کا بہت کم امکان تھا کہ اسے سائنس کے میدان میں کوئی ایسا مقام مل جائے کہ اس کی زندگی آرام و آسائش سے گزرے۔ طب کی طرف اس نے خود دھیان نہیں دیا اور حیاتیات میں غربت سے چھٹکارا نہ ملا۔ حتیٰ کہ 1886ء تک وہ اپنی منگیتر سے شادی کرنے کی عیاشی کا متحمل نہ ہوسکا۔ اسے اس گناہ کا بھی شدید احساس تھا کہ اس کے والدین اس کے لئے مسلسل قربانیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ اس نے حیاتیات کو خیر باد کہا اور مرض عصبی (Neuropathy) کے میدان کا انتخاب کیا۔ شادی کے بعد ان کے ہاں چھ بچے پیدا ہوئے' ان میں سے ایک بیٹی اینا (Anna) مشہور نفسیات دان تھی۔ 1982ء میں فوت ہوئی۔

ڈاکٹر فرائڈ ان چند خوش قسمت عظیم لوگوں میں سے ہے' جس کا تخلیقی رویہ وقفوں وقفوں سے طویل عرصے تک قائم رہا۔ اس نے انسانی شخصیت کے نئے نئے گوشے دریافت کئے' اس کی زندگی کا آغاز ایک بہت ہی معمولی حیثیت سے ہوا مگر جب وہ فوت ہوا تو زندگی کے عظیم مسائل پر غور و فکر کر رہا تھا۔ فرائڈ کی تقریباً تمام دریافتیں انسانی شخصیت کے باب میں وہ انکشافات ہیں جنہوں نے نفسیاتِ انسانی کو نئے پہلوؤں سے آشنا کیا اور اس کے ان باطنی اور پوشیدہ ابعاد (Dimensions) کی طرف توجہ دلائی جو اس وقت تک ماہرینِ نفسیات کے لئے شجرِ ممنوعہ تھے۔ فرائڈ نے انسانی شخصیت کی عمیق تہوں میں غوطہ زنی کی' نفسیات میں افقی بعد کے ساتھ ساتھ عمودی کا اضافہ کیا' اور اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ انسان کے افعال و اعمال جو نظر آتے ہیں ان کی معنویت اس سے بہت زیادہ اور مختلف ہے۔ اس کے بہت سے افعال و اعمال کے محرکات' لاشعور کی گہری تہوں میں پوشیدہ ہیں جن سے وہ خود بھی اکثر اوقات ناواقف رہتا ہے۔ نیز انسانی شخصیت کے بہت سے تضادات' تصادم اور کشمکشوں کا منبع خود اس کی ذات ہے۔ ''انسانی شخصیت میں تضادات اور تصادم کی بنا پر ہمیں یہ ادراک بھی ہوا کہ انسانی شخصیت کوئی ''دو اور دو چار'' قسم کی حقیقت نہیں بلکہ عمل' ردِعمل' تضاد اور تصادم کا ایک پیچ در پیچ سلسلہ ہے۔ یعنی انسان کا ٹکراؤ صرف خارج ہی کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ خود اپنی شخصیت میں بھی اسے قدم قدم پر ایسی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی بنیاد خود اس کے متضاد محرکات ہوتے ہیں۔ اس کے یہ اندرونی تضادات اور شعور اور لاشعور کے باہم دیگر برسرِ پیکار مطالبات اس کے ذہن کو میدانِ کارزار بنائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح اِڈ' ایگو اور سپر ایگو کے متضاد تقاضے فرد کی شخصیت میں داخلی کشمکش کا منبع بنے رہتے ہیں''۔ (پروفیسر ساجدہ زیدی)

شہزاد احمد کے مطابق فرائڈ اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی بنیاد پرست نہیں رہا۔ بلکہ مذہبی نظریات کے معاملے میں وہ لاادری (Agnostic) ہی نظر آتا ہے۔ آخری عمر میں اس نے ایک کتاب ''موسیٰ اور وحدانیت'' (Moses and monotheism) لکھی تھی جس میں اس نے نہ صرف یہودی مذہب پر کچھ اعتراضات کئے تھے بلکہ خود حضرت موسیٰؑ پر بھی شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا۔ مگر یہ کتاب فرائڈ کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی کیونکہ ڈارون کی طرح فرائڈ کو بھی خدشہ تھا کہ یہودی اس کتاب کے بارے میں شدید

ردِعمل کا اظہار کریں گے۔ مگر بعد میں یہ کتاب شائع ہوئی تو یہودیوں کے سیاسی مسائل' اعلانِ بالفور 1917ء کے باوجود ابھی تک اس قدر پیچیدہ اور مایوس کن تھے کہ وہ اس کتاب کے بارے میں اپنا متوقع ردِعمل کبھی ظاہر نہ کر سکے۔ یہودیت کے بارے میں شکوک وشبہات رکھنے کے باوجود فرائڈ اپنا تعلق یوروپ کی یہودی برادری سے منقطع نہیں کر سکتا تھا۔ ابتدا میں تو فرائڈ نے وکیل بننے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا تاکہ اپنے گروہ کے حقوق کے لئے جدوجہد کر سکے مگر بعد میں اس نے اس فیصلے پر عمل نہیں کیا۔ تاہم اس کی یہ خواہش ضرور رہی کہ یہودیوں کو معاشرے میں بہتر مقام حاصل ہو۔ آئن سٹائن بھی ایسا ہی سوچتا تھا۔ اس وقت وکالت ان چند معقول پیشوں میں سے ایک تھی جس کے دروازے آسٹریا کے یہودیوں کے لئے کھلے تھے۔ فرائڈ کا ایک سوتیلا بھائی دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی انگلستان آباد ہو گیا تھا' مگر فرائڈ اپنے خاندان کے ساتھ ویانا میں ہی رہائش پذیر رہا۔ جس آبادی میں وہ رہتا تھا اس کا نام قیصر جوزف سٹراس تھا۔ فرائڈ کہتا ہے کہ جوزف (یوسف) کے نام نے اس کے خوابوں میں ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ شہزاد احمد کے الفاظ میں ''فرائڈ کا ذاتی خیال یہ ہے کہ خوابوں میں جو بادشاہ اور بزرگ نظر آتے ہیں وہ اصل میں باپ ہی کی شبیہ ہوتے ہیں' مگر خود یہودیت کے حوالے سے خوابوں کی تعبیر کا تعلق حضرت یوسفؑ کے ساتھ گہرا رہا ہے۔ چونکہ فرائڈ بھی وہی کام کرتا تھا' جو حضرت یوسفؑ نے کیا تھا' اس لئے یہ نام اس کے لئے اہمیت اختیار کر گیا تھا''۔

فرائڈ کا وضع کردہ سارا نظام علت ومعلول کا ایک سلسلہ ہے۔ خصوصاً اٹھارویں اور پہلی نصف انیسویں صدی کے سائنسی نظریات پر مادہ پرستی کی جبریت (Determinism) کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ میں پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں کہ اسی جبریت کے نظریے کے تحت ماہرین طبعیات کو یہ فکر لاحق ہو چکی تھی کہ طبعیاتی سائنس کا بس اب خاتمہ ہونے والا ہے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلسل مادے کی خصوصیات (Properties of Continuous Matters) مثلاً لچک اور احتمالِ حرارت (Elasticity and heat condition) کے ذریعے ہر چیز کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ پھر' اسٹیفن کے بقول

"In 1928, physicist and nobel prize winner max Born told a group of visitors to Gottingen university" physics as we know it, will be over in six months."

لیکن ''ایٹمی ساخت اور اصولِ غیر یقینی کی دریافت نے اس تصویر کو خاک میں ملا دیا''۔ فرائڈ نے کھلے دل کے ساتھ جبریت کے نظریے کو قبول کر لیا تھا اسی لئے وہ کسی صورت میں یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ کوئی فعل یونہی سرزد ہو یا اس کی وجہ انسانی اختیار (Free Will) ہو۔ اس نے یہ بیان کیا تھا کہ تمام اعمال اور فیصلے بعض محرکات کے مرہون منت ہیں اور وہ بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ ہم یوں کر لیں یا یوں کر لیں۔ شہزاد احمد کے مطابق اس جبریت کی اصل وجہ ڈارون

ہے ''اگرچہ ڈارون نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ اس کے نقطۂ نظر میں بہت سی خامیاں ہیں' ان خامیوں کو اس نے گمشدہ کڑیوں کا نام دیا تھا۔ ایک خلوی جاندار مادے سے انسان تک جو سلسلہ اس نے بنایا تھا' اب شاید ہی اس کی کوئی کڑی باقی رہ گئی ہو۔ مگر وہ اصول جو حیاتیات میں جبریت کا اصول ہے جوں کا توں قائم ہے۔ فرائڈ کے نظریات بھی بہت سے اور نظریات کی طرح ارتقاء کے تصورات ہی پر مبنی ہیں۔ خود فرائڈ کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح نفسیات کو اس زبان میں بیان کرلے' جس زبان میں دوسرے علوم بیان ہوتے ہیں' اطلاقی نفسیات میں تو شماریات کی مدد سے ایسا کرنا کسی حد تک ممکن ہے' مگر جہاں تک تحلیل نفسی کا معاملہ ہے' اس کا تعلق انسانی باطن سے ہے' اور انسانی باطن کے مطالعے کے لئے کوئی شماریاتی طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا اور نہ ہی شاید مستقبل قریب میں ایسا کوئی امکان نظر آتا ہے''۔

شہزاد احمد کے مطابق فرائڈ کی نفسیات کے دو دور ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی اس نے اپنے نظریات کی توجیہہ کر دی تھی۔ مگر وہ کچھ مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ 1905ء کے بعد تقریباً دو عشروں تک اپنے نظریات کو تبدیل کرتا گیا۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی یہ تھی کہ وہ ذہنی مریضوں کا علاج کرے اور ان عوامل کو سمجھنے کی کوشش کرے جو فرد یا معاشرے میں نفسیاتی بے اطمینانی کا باعث ہیں۔ بعض نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ زندگی کے دوسرے دور میں فرائڈ نے مطمی مواد کی بجائے نظریہ سازی پر زیادہ انحصار شروع کر دیا تھا۔ اب اس کا رویہ شماریاتی سائنس دان کی بجائے فلسفی کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جنس کے نظریے کو وہ جتنی وسعت دے سکتا تھا' دے چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس سوال کو بہت اہمیت حاصل ہوئی تھی کہ آیا انسان کے اندر کوئی ایسی خرابی تو نہیں جو اسے بار بار تخریب و تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سوال کا جواب یقیناً جنس کے حوالے سے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح سادیت (Sadism) اور مساکیت (Masochism) کے تصورات محدود تھے جن کا تعلق محض خاندانی ایڈی پس سے تھا لہٰذا فرائڈ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا کہ پوری قوم یا بہت سی قومیں جنگ کے بخار میں کیوں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بننے والی لیگ آف نیشنز میں فرائڈ نے آئن سٹائن کی دعوت پر ایک تحریری بیان بھی دیا تھا جس میں اس نے تسلیم کیا تھا کہ انسانیت کو جنگ کی صعوبتوں سے بچانا ممکن نہیں۔ امریکی نفسیات داں رابرٹ۔ ایس۔ وڈورتھ کے بقول فرائڈ کے پہلے دور اور دوسرے دور کے خیالات میں مشترکہ مواد کم ہے۔

فرائڈ کے دوسرے دور کی کہانی کا آغاز اُس بچے کی کہانی جیسا ہے جس کا حوالہ ایک یونانی دیومالا (Myth) کہانی میں دیا گیا ہے۔ جس کو فرائڈ نے تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اُس نے تو اصطلاح بھی وہی استعمال کی ہے جو یونانی اساطیر سے مستعار تھی اور جس کا تعلق نرگسیت سے ہے۔ اس قدیم یونانی کہانی کے مطابق نارسس (Narcissus) ایک خوبصورت نوجوان تھا جو ابھی کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا تھا کہ اُس نے ایک صاف و شفاف تالاب میں اپنا عکس دیکھا تو اپنی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ بعد میں وہ

تالاب میں گرا اور ایک ایسے پھول (نرگس) کی صورت اختیار کر گیا جو پانی کی طرف جھکا رہتا ہے۔ چنانچہ نرگسیت میں مبتلا فرد وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے عشق کرتا ہو اور جنسی لذت اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر حاصل کرتا ہو۔ فرائڈ نے نرگسیت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اپنی ذات کی محبت کو معروض کی محبت سے پہلے وقوع پذیر ہونا چاہئے۔ کیونکہ بچہ آغاز میں اشیا کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس لئے بچہ اپنے لبیڈو (Libido) کا رخ اپنے جسم کی طرف کر دیتا ہے جس سے اسے بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فرائڈ نے اپنی کم وبیش تمام تحریروں میں طفلی جنسیت (Infantile Sexuality) پر بہت زور دیا ہے۔ اس کے تصورات کے مطابق جنسی جبلت موجود ہوتی ہے مگر خوابیدہ (Latent) حالت میں ہوتی ہے۔ اور اپنا اظہار دوسری قسم کی حرکتوں کے ذریعے کرتی ہے، جو اگر جنسی عمل نہیں ہوتیں لیکن عہد طفولیت میں جنسی تسکین کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر فرائڈ نے ان حرکتوں کی بہت سی مثالیں بھی دی ہیں۔ ان میں جوان افراد کی اپنی ہی جنس سے لذت وتسکین حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ اسے ہم جنسیت پرستی (Homo Sexuality) کہا جاتا ہے۔ اس باب میں فرائڈ کی دی ہوئی تفصیلات اور تمثال سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں پر صرف فرائڈ کی ایڈی پس (Oedipus Complex) الجھن کا ذکر ہوگا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بچے کے لبیڈو کا رخ شروع شروع میں اپنی ہی ذات کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے مطابق عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بچے کا لبیڈو ماں کے ساتھ اور بچی کا لبیڈو باپ کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے۔ یہ ایک جبلی مخالف رجحان ہے۔ اس میں بیٹا، باپ کا حریف بن جاتا ہے اور بیٹی ماں کی طرف معاندانہ رویہ رکھتی ہے۔ اس شہرۂ آفاق رومان کے مفروضے کی بنیاد پر فرائڈ نے ایڈی پس کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی ہے۔ اس کا خیال دراصل فرائڈ کو ایک قدیم یونانی ڈرامہ نگار سوفوکلیز (Sophocles) کا ڈرامہ ''ایڈی پس ریکس'' دیکھ کر آیا جو اس نے ویانا کے ایک تھیٹر میں دیکھا تھا۔ ڈرامے کے مطابق ایڈی پس کا باپ ایک بادشاہ تھا اور ایڈی پس کی پیدائش پر پیشین گوئی کی گئی کہ وہ باپ کو قتل کر دے گا اور ماں سے شادی کرے گا۔ چنانچہ باپ نے اسے جنگل میں پھنکوا دیا۔ ایک چرواہے نے اسے رہائی دلوائی اور اک ہمسایہ ملک کے بادشاہ نے اسے متبنّی بنا لیا۔ جوان ہونے کے بعد ایک دن وہ عبادت گاہ میں گیا، تو اسے بتایا گیا کہ وہ اپنے باپ کو قتل اور ماں سے بیاہ رچائے گا، اس بدقسمتی سے بچنے کے لئے وہ اپنے لے پالک کے محل سے دور رہا، مگر اس آوارگی کے دوران اُس کی مڈبھیڑ اپنے باپ سے ہوگئی جسے اس نے بے خبری میں قتل کر دیا اور اسی آوارگی میں اپنے وطن تھیبز (Thebes) جا پہنچا جہاں اس نے سفنکس (Sphinx) کی پہیلی بوجھ لی۔ یونانی اساطیر میں سفنکس ایک مادہ بلا (Monster) تھی۔ وہ ان لوگوں کو قتل کر دیتی تھی جو اس کی پہیلی کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ پہیلی یہ تھی کہ وہ کونسی مخلوق ہے جو صبح کو چار پاؤں پر چلتی ہے، دوپہر کو دو پاؤں پر اور شام کو تین پاؤں پر چلتی ہے۔ ایڈی پس نے جواب دیا تھا انسان، یعنی بچہ چار پاؤں پر، جوان دو پاؤں پر اور بوڑھا لاٹھی کے

سہارے پر تین پاؤں کے ساتھ چلتا ہے۔

ایڈی پس کے درست جواب دینے پر شہر کو بلاؤں سے آزاد کرا لیا گیا اور لوگوں نے اسے بادشاہ بنا لیا اور بیوہ ملکہ سے اس کی شادی ہوگئی۔ زمانوں کے بعد جب ان کے ہاں چار بچے پیدا ہو چکے تھے تو اس پر حقیقت ظاہر ہوئی تو ایڈی پس نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔ فرائڈ جب ڈرامہ دیکھ کر لوٹا تو اس کے ذہن میں یہ خیال جاگزین ہو چکا تھا کہ یہ ڈرامہ ہر گھر میں دہرایا جاتا ہے۔ فرائڈ کو اس کہانی کے خاکے کی ضرورت تھی' آگے نمک مرچ' اور رنگ وروغن کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام' تھا۔ خود فرائڈ نے بھی اپنے دوسرے دور میں اسے سپرا ایگو کا نام دیا ہے۔ جب بچہ لبیڈو کی فوری لذت سے رہائی پا کر مقابلتاً پرسکون اور بہتر تربیت کے دور میں داخل ہوتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک لبیڈو انسانی نفس میں ایک زبردست خودکار اور خود اظہار قوت ہے۔ جو قبل پیدائش سے لے کر موت تک جاری رہتی ہے۔ یہ قوت پیدائشی' جبلی اور حرکی ہے جو ہمارے تمام عمل اور حرکت کی ضامن ہے۔ یہ ایک برقی قوت کی مانند ہے۔ جو اظہار و نمو کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اور کسی ماحول' تربیت اور اکتساب کی دین نہیں۔ اس انسانی نفسی قوت کے دو رُخ ہیں۔ ایک مثبت یعنی ایروس (Eros) یا جبلتِ زندگی اور دوسرا منفی یعنی تھناٹوس (Thanatos) یا جبلتِ موت۔ ایروس اپنا اظہار' زندگی دینے والے تمام رجحانات مثلاً جنس' محبت' افزائشِ نسل' تہذیبی ترقی' ارتقائی عمل' خواہش' نمو' اشتراکِ فکر و عمل' تخلیقی اظہارات' اقدارِ حیات اور اخلاقیات وغیرہ کے ذریعے کرتا ہے۔ یعنی ہر وہ جذبہ' خیال اور عمل جو کسی طور پر بھی انفرادی و اجتماعی بقا کا ضامن ہو اور جوشِ نمو کا حامل ہو' ایروس کا زائیدہ ہوتا ہے۔ بلکہ بقول ساجدہ زیدی ''ایروس کی ہی قوت کا ایک رخ ابدی زندگی کی تلاش یا زندگی بعدِ موت کی آرزو ہے۔ اس طرح انسان نے ان مذہبی عقائد کی بنا ڈالی ہے جو ایک ابدی زندگی' سزا و جزا کے تصور' جنت و دوزخ کے تصورات اور آواگان کے دائرے کا یقین دلاتے ہیں۔ یہ محض شہرت کی تمنا نہیں بلکہ زندگی کی بقا کی تمنا ہے۔ فرائڈ کا یہ نظریہ کسی حد تک برگسان کے نظریۂ تخلیقی ارتقا کے مماثل ہے''۔ محترمہ ساجدہ زیدی کی اس باب میں دیگر تحریرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے 'ایروس' کی تشریح کی ہے اور ایسے نظریات ان کے اپنے نہیں ہو سکتے۔ اور اگر یہ نظریات واقعی ان کے اپنے ہیں تو یہ سخت تعجب انگیز بات ہوگی۔ کیونکہ یہ بات انسانی شعور اور نفسیات کے قطعی خلاف ہے کہ وہ اپنے لئے سزا عذاب' تکلیف یا جہنم کی آرزو کرلے۔ کسی نارمل اور معقول انسان سے ایسی امید یا گمان تک رکھنا ناممکن ہے۔ طبیعی کائنات کا نظام قانونِ مکافاتِ عمل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ جنہیں قوانینِ فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ اور دین کا تو سارا نظام ہی اسی قانون کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے' انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ذات نشوونما پا کر اس دنیا میں باوقار اور خوش گوار زندگی گزارے اور اس کے بعد آخرت میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ جنتی زندگی ہے اور اس کے برعکس جس فرد کی ذات کی نشوونما رکی رہی وہ اگلی ارتقائی منزل سے محروم رہ جائے گا۔ یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ لہٰذا ابدی زندگی' سزا و جزا

اور دوزخ و جنت کا تعلق کسی انسان کی آرزوؤں اور خواہشات پر منحصر نہیں۔ یہ ارشاداتِ خداوندی کی رُو سے حقائق ہیں۔ اور نہ ہی ان عقائد کی بنا انسان نے ڈالی ہے۔

فرائڈ کے نزدیک تھناٹوس یا لبیڈو کی منفی قوت بھی اسی قدر فعال ہوتی ہے جس قدر مثبت قوت یعنی ایروس۔ یہ متضاد قوت' رجحانِ موت یا ''خواہشِ مرگ'' ہے۔ یہ بھی انسانی نفس کے تضاد ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان جس شدت سے زندگی اور اس کے مثبت تقاضوں کی خواہش کرتا ہے اور حیات بخش سلسلہ ہائے عمل پر مائل رہتا ہے' اسی شدت سے وہ موت کی طرف بھی دوڑتا ہے۔ یہ منفی قوتیں بھی اس کی سائیکی کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان کی پذیرائی بھی نسل اِنسانی نے' اور خود افراد نے اسی شدومد سے کی ہے جس طرح سے قوتِ حیات ونموکی۔ خواہشِ مرگ' بھی اپنے اظہار کے لئے بے شمار بالواسطہ علامتی راہیں تلاش کرتی ہے۔ ہمارے بہت سے افعال اور جذبات میں قوتِ مرگ کی کارکردگی شامل ہوتی ہے۔ جن میں قتل وغارت گری' ہنگامی حالات میں خون ریزی اور جارحیت وغیرہ شامل ہیں۔ اس قوت کی آخری حد خودکشی ہے لیکن اس حد تک بہت ہی کم لوگ پہنچتے ہیں۔ خود اذیتی (Masochism) اور دیگران اذیتی (Sadism) اور عام انسانیت کش رویے بھی اس میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں عام انسانوں کی زندگی میں یہ بے مدعا تنقید وتنقیص' عیب جوئی' بے دردی' بے حسی' تعصب' تحقیر وتذلیل کے روّیے' استحصال' ظلم' غلامانہ ذہنیت' اپنے نفس کی تحقیر جیسے متنوع کرداری طریقوں کی صورت میں بھی یہ جبلت اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ وہی نسل اِنسانی ہے جسے محبت' افزائشِ نسل' تخلیق' تفکر' جنسی کشش' رحم' ہمدردی' آزادی' اخوت' شرافت اور اخلاقیات جیسے زندگی بخش رجحانات اور ان کے پس پردہ قوتِ حیات سے بھی نوازا گیا ہے۔ نسلِ انسانی ایسے ہی تضادات کی حامل ہے جو ایک طرف تخلیق ونمو اور ارتقاء پر مائل ہے تو دوسری طرف تخریب وجارحیت' بدی اور شر کی حامل بھی ہے۔ یہی دو قوتیں ہر زمانے میں خیر وشر کے تصادم میں بھی کارفرما رہی ہیں۔ فرائڈ نے ابتدا میں ان دونوں قوتوں کو جبلتِ جنس اور جبلتِ جارحیت کا نام دیا تھا۔ لیکن بعد میں ان کی ہمہ گیری کے انکشاف پر ان کو جبلتِ حیات اور جبلت مرگ کا نام دیا تھا۔ یوں ان کی معنویت اور دائرہ کار کو وسعت دی۔ آٹو فینیکل (Otto Finichel) ان ماہرین میں سے ہے جنہوں نے حیات وموت کی جبلتوں کی ثنویت کا انکار کیا ہے۔ ان کے مطابق تشدد کے روّیے کا تعلق انگیزشوں کے تصادم سے بھی ہوسکتا ہے مگر جو کچھ بھی ہے اس کی وجہ اردگرد کے ماحول کی صورت حال ہے۔ اور بنیادی اندرونی ثنویت کو اس کی وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح شہزاد احمد کے مطابق اب نئے ماہرینِ تحلیل نفسی ایڈی پس الجھن کو ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے جو فرائڈ نے متعین کرنے کی کوشش کی تھی۔

ڈاکٹر فرائڈ سے پہلے یورپ میں روائتی طور پر ہسٹریا اور دیگر ذہنی مریضوں کا علاج زیادہ تر ہپناٹزم کے ذریعے کیا جاتا تھا اور ان مریضوں سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ بسا اوقات انہیں بھوت پریت اور چڑیلوں وغیرہ سے منسلک کرکے انہیں

خطرناک اور منحوس سمجھا جاتا تھا۔ سترہویں صدی تک امریکہ اور یوروپ میں جادوٹونے کی باتیں عام تھیں۔ یوروپ کے مشہور سائنسدان جوہانز کیپلر کی ماں کو چڑیل قرار دے کر سزا کا مستحق سمجھا گیا تھا اور کیپلر نے بڑی مشکل سے اپنی ماں کو سزا سے بچایا تھا۔ 1695ء میں امریکہ کی ریاست میساچوسٹیس میں عدالت نے جادوٹونا کرنے کے الزام میں صرف ایک ماہ کے دوران پانچ عورتوں کو پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ یوروپ میں ایک رحم دل اور شفیق ذہنی معالج شارکوٹ م1897ء نے ذہنی مریضوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے کی ابتداء کی۔ فرائڈ نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ شارکوٹ بھی ذہنی امراض کا تعلق زیادہ تر جنس کے ساتھ سمجھتا تھا۔ فرائڈ کا کہنا ہے کہ دوسری جبلتوں کی طرح جبلتِ جنس بھی پیدائش کے وقت ہی موجود ہوتی ہے اور قطعاً بے عمل نہیں ہوتی (جیسا کہ دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ جبلتِ جنس عنفوانِ شباب تک مضمر اور بے عمل رہتی ہے) بلکہ یہ اپنا اظہار مختلف علامتی پیرایوں میں کرتی ہے جنہیں فرائڈ طفلانہ جنسی اظہارات کا نام دیتا ہے۔ اور شخصیت کی نشوونما میں ان کی بڑی اہمیت سمجھتا ہے۔

ہنری برگسان کے نزدیک انسان کی یادداشت ختم یا ضائع نہیں ہوتی اور یوں وہ انسان کا تمام ماضی اس کی ناقابلِ تحلیل یادداشت کی صورت میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ فرائڈ کا بھی یہی خیال ہے کہ جو شے کبھی یاد تھی اس کے فراموش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف ہوتا یہ ہے کہ ایسی یادداشتوں کو لاشعور کے سرد خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ البتہ ایسی باتیں جنہیں یاد رکھنا تکلیف دہ ہو، وہ بھلا دی جاتیں ہیں۔ فرائڈ نے نفسیاتی امراض کی تشخیص کے لئے اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر ایک طریقہ مرتب کیا جس کا نام تحلیل نفسی رکھا تحلیل نفسی نفسیاتی علاج کا ایک طریقہ ہی نہیں تھا بلکہ تحقیق کا بھی ایک موثر ذریعہ ثابت ہوا۔ پوشیدہ محرکات کو دریافت کرنے کا طریقہ آزاد تلازمہ (Free Association) تھا، یہی کام خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی بچپن کی ایسی خواہشات اور انگیزشیں جو کبھی بھی شعور کی سطح تک نہیں پہنچتی، خوابوں میں ان کا ظہور اور نمائندگی ہوتی ہے۔ آزاد تلازمہ تحلیل نفسی کا طریقہ کار ہے۔ اس میں ذہن میں آئی ہوئی ہر شے بتانی پڑتی ہے، خواہ وہ اذیت ناک، پریشان کن اور بظاہر غیر منطقی ہی کیوں معلوم نہ ہو۔ اس کے بعد اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جس طرح خوابوں کا تجزیہ تعبیر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

تحلیل نفسی (Psycho-analysis) نفسیاتی نظریات اور طریق کار کا ایسا نظام ہے جو فرائڈ نے متعارف کرایا تھا، اس میں اس کے شاگردوں مثلاً ژونگ اور اڈلر وغیرہ کا بھی حصہ ہے۔ اس نظریے کے بنیادی تصورات لاشعور، تحریک، تصادم اور رمزیت (Symbolism) ہیں۔ فرائڈ نے جلد ہی دریافت کرلیا تھا کہ مریض کی یادیں سلسلہ وار طریقے سے بچپن تک جاتی ہیں اور ان کا تعلق ایسے جنسی تجربات سے ہوتا ہے جن کی نوعیت زنائے محرم (Incest) کی ہوتی ہے۔ فرائڈ اِس خیال سے متفق نہیں کہ نیوروسس (Neuro disorders) جس میں ہسٹریا، تشویش اور خبط وغیرہ شامل ہیں، کی نوعیت موروثی ہوتی ہے بلکہ اس کی بجائے فرائڈ کے نزدیک یہ فرد کی اپنی زندگی کے بعد ناخوشگوار واقعات کے ساتھ متعلق ہے۔ جب ان جنسی یادداشتوں کو لاشعور کے کسی حصے میں پھینک دیا جاتا ہے تو فرائڈ کے نزدیک یہ ایک زہر ہے جو لاشعور میں دبا دیا جاتا ہے، پھر یہ بعد کی زندگی میں ذہنی یا

جسمانی علامتوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ پھر سے ان یادوں کو اوپر لایا جائے۔ اسی طریقہ علاج کو تحلیل نفسی کہا جاتا ہے۔

فرائڈ کے طفلی جنسیات کے نظریات پر یہ سوال بھی سامنے آیا کہ کیا یہ جنسی تجربات وقوع پذیر بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ ابتدائی طور پر فرائڈ کا ایمان تھا کہ ایسا واقعاتی طور پر ہوا کرتا ہے۔ 1896ء میں فرائڈ نے اپنی غلطی تسلیم کر لی' گو یہ بات اس نے اپنے آپ تک محدود رکھی لیکن بعد میں 1905ء میں اس نے اس کا پبلک اظہار کر دیا اور تجویز کیا کہ ان یادداشتوں کو فنٹاسیا (Phantacy) یعنی من موجی واہمہ سمجھا جائے جو شعوری طور پر ایک خوشگوار جاگتے خواب کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس میں قوتِ متخیلہ کا عمل دخل شدید ہوتا ہے۔ صحت مند جنسی زندگی میں فنٹاسیا کا کردار اہم ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی میں فنٹاسیا کا ذکر بھی آتا ہے مگر لاشعوری انداز میں۔ اس سلسلے میں کچھ حلقوں کی طرف کہا گیا کہ فرائڈ نے خوفِ فسادِ خلق کی وجہ سے اس تصور کو حقیقت کی بجائے واہمہ قرار دے دیا' مگر شہزاد احمد اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں ''میرے خیال میں یہ تاثر درست نہیں ہے' جبکہ اس نظریے کو متعارف ہوئے کوئی دس برس گذر چکے تھے اور فرائڈ اس سلسلے میں جس مخالفت کی توقع کر سکتا تھا وہ گذر چکی تھی' تو پھر اسے تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اصل میں زندگی کے حقائق کے بارے میں فرائڈ کا نقطہ نظر تبدیل ہو رہا تھا اور یہ تبدیلی بھی اس کا ایک حصہ تھی''۔ اس سلسلے میں ان کا مزید کہنا ہے کہ ''یہاں شاید یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ اگر آپ کو نینسی فرائڈے (Nancy Friday) کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو' تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس فنٹاسیا کا عمل دخل انسانی زندگی میں کس قدر فراواں ہے۔ خصوصاً عورتوں کی زندگی میں تو یہ عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پھر ان میں 'Incest' کی کارفرمائی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ چلئے اگر مان بھی لیں کہ مریض صرف فنٹاسیا میں مبتلا ہے تو اس سے یہ تو کھلتا ہے کہ وہ جنسی طور پر فعال ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی خیال ہے جو روائتی' اخلاقی' مذہبی' تعلیمی اور معاشرتی خیالات کو تہس نہس کر دیتا ہے اور اس سے بچے کی پرورش کے تمام طریق کار تبدیل ہو جاتے ہیں اور بچہ معصوم فرشتہ نہیں رہتا' جیسا کہ روائتی طور پر فرض کیا جاتا ہے''۔ فرائڈ ہمیشہ پوشیدہ خواہشات تلاش کرتا رہا جن کا تعلق ماضی سے ہو مگر وہ لاشعور میں ابھی زندہ ہوں۔ اُس کے مطابق خوابوں کے اندر جو آرزومندی پائی جاتی ہے' اس سے کسی حالیہ خواہش کی تسکین نہیں ہوتی' بلکہ اس کا تعلق ماضی کی خواہشات سے ہوتا ہے۔ نیوروسس کا تعلق بھی ماضی کے ساتھ ہے۔

ویسے تو فرائڈ کے بہت سے خیالات ایسے تھے' جنہوں نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا اور علمی حلقوں کے ساتھ ساتھ ثقافتی حلقوں میں بھی ان کی بازگشت سنائی دیتی تھی اور اب تک سنی جا رہی ہے۔ شہزاد احمد کے مطابق فرائڈ نے وہ مثالیں دی ہیں جو تحلیل نفسی کے حوالے سے آرٹ اور ادب کو سمجھنے اور سمجھانے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ مگر فرائڈ کی سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ نیوروسس جنسی عدم توافق (Maladjustment) کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ شہزاد احمد اس معاملے میں کہتے ہیں کہ ''فرائڈ نے کہا کہ مریضوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آوارہ مزاج ہیں جبکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو دباتے رہتے

تھے۔اس نے اس کا یہ علاج بھی تجویز نہیں کیا کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے معاشرے میں جنسی آزادی کو رواج دے دیں۔ بلکہ اس نے پوری کوشش کی کہ اس طرح کا رویہ پیدا نہ ہونے پائے۔اس نے اس مقام کی طرف لوٹنے کی کوشش کی' جہاں سے یہ مسئلہ شروع ہوا تھا اور اس سلسلے میں وہ ہمیشہ بچپن کے آغاز تک پہنچا۔اس کا دوسرا حیران کن بیان یہ تھا کہ چھوٹے بچوں میں جنس اور کمینگی کے رجحانات آسانی سے مشاہدہ کئے اور کرائے جا سکتے ہیں''۔فرائڈ کے وضع کردہ ''طفلی جنسیت'' کے مفروضے کو اب کوئی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ خود اس کے اپنے شاگردوں مثلاً ژونگ نے اس نظریے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ساجدہ زیدی کا بھی یہی کہنا ہے کہ ''فرائڈ کے جنسیت طفلی'' اور اس کے دباؤ کو قوی ترین محرک کے طور پر پیش کرنا ایک ایسا مفروضہ ہے جس سے بعد کے ماہرین نے بنیادی اختلاف کیا ہے اور اسے فرائڈ کے تخفیفی روّیے (Reductive Aptitude) پر محمول کیا ہے''۔تاہم جنس کو اتنی اہمیت دینے کے باوجود' فرائڈ نے معاشرے میں جنسی آزادی کی کبھی بھی حمایت نہیں کی۔ پاکستان کے ایک بہت بڑے ادیب ڈاکٹر سلیم اختر نے ''تین بڑے نفسیات دان'' نامی اپنی تصنیف میں بھی کہا ہے کہ فرائڈ نے ایک متمدن انسان کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ معاشرے میں اپنی شہوانی اور ہیجانی تحریکات کو بے لگام نہ ہونے دے۔ جہاں تک خود جنسی تحریکات کا تعلق ہے تو سلیم اختر کے مطابق فرائڈ 45 سال کی عمر میں ہی عملی طور پر جنسی تعلقات سے دستبردار ہو چکا تھا۔

تحلیل نفسی کی تحریک کا آغاز بنیادی طور پر ان مجلسوں کی وجہ سے ہوا تھا' جو 1902ء میں فرائڈ کے گھر میں منعقد ہوتی تھیں اور اس میں اس کے مطبی دوست شرکت کرتے تھے۔1906ء میں وی آنا میں تحلیل نفسی سوسائٹی (Psycho-Analytical Society) تشکیل دی گئی جس کا پہلا صدر زیورچ یونیورسٹی کا ماہر نفسیات کارل ژونگ م 1961ء بنا۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ژونگ کو صدر اس لئے بنایا گیا تا کہ لوگ اس سوسائٹی کو صرف یہودی لابی سے مخصوص نہ سمجھیں۔آزاد تلازمۂ خیال کے تحت علاج کرنا بہت طویل اور بہت مہنگا علاج ہے۔ان نشستوں کا طویل عرصے تک جاری رہنا' موجودہ تیز رفتار دور میں اہم مسئلہ ہے۔لہٰذا کئی بار یہ کوشش کی گئی کہ اس علاج کا کوئی مختصر مدت کا طریقہ ایجاد کیا جائے' مگر تحلیل نفسی کی حد تک اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی۔ ان لمبی لمبی نشستوں کے بارے میں فرائڈ کو ایک تشویش یہ بھی تھی کہ کوئی بھی غیر محتاط معالج دو طرح کا استحصال کر سکتا ہے' یا تو وہ مریض سے بڑی بڑی رقمیں بٹور سکتا ہے یا پھر جنسی طور پر استحصال کرنے لگ جائے۔لہٰذا اس کے نزدیک معالج کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی طرح کی بھی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرے۔شہزاد احمد کے مطابق فرائڈ اِس معاملے میں بے حد محتاط تھا' وہ کسی قیمت پر بھی نہیں چاہتا تھا کہ تحلیل نفسی بدنام ہو۔فرائڈ کے بارے میں کبھی بھی یہ تاثر پیدا نہیں ہوا کہ اس نے اپنے مریضوں کے ساتھ کوئی غیر محتاط روّیہ اختیار کیا ہوا۔حالانکہ عام معالجین پر مریضوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرنے کا الزام موجود ہے۔اور بعض تو جنسی تعلقات کے بھی مرتکب ہوئے۔لہٰذا فرائڈ کے لئے اس احتیاط کا جواز موجود تھا۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر انعام الحق

باب المراسلات

چیئرمین ادارتی بورڈ ادارہ طلوع اسلام ڈاکٹر انعام الحق صاحب نے ادارہ کی نمائندگی کرتے ہوئے سوشل میڈیا میں قرآن کے متعلق اُٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات کا سلسلہ کافی دیر سے شروع کر رکھا ہے۔ طلوع اسلام کی انتظامیہ نے فیصلہ لیا ہے کہ طلوع اسلام کے پرچہ میں باب المراسلات کا احیا کر کے اُن کے سوالات و جوابات کو باقاعدہ شائع کیا جائے۔ اس ضمن میں پہلی قسط حاضرِ خدمت ہے۔ (ادارہ)

اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (2:110)

بے شک تمہارا کوئی عمل اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل سے اُوجھل نہیں۔

محترم پرویز صاحب کی لغات القرآن سے منتخب اہم قرآنی اصطلاحات اور محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار قرآن کے اپنی رہائش میں دیئے گئے دروس سے نہایت اختصار کے ساتھ انتخاب کر کے سوشل میڈیا پر روزانہ دونوں بالترتیب درجن بھر گروپس میں شیئر کر رہا ہوں۔ یہ سلسلہ سال بھر سے روزانہ ہزاروں افراد تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ میرے اپنے تشکیل شدہ گروپ In the search of turth میں 1750 افراد نے ممبر شپ حاصل کر لی ہے۔ میری ان پوسٹس پر بیشمار لائکس اور کمنٹس ہوتے رہتے ہیں۔ محترم اکرم راٹھور چیئرمین ادارہ کی خواہش پر سوشل میڈیا کے کمنٹس پر اعتراضات کے سوال و جواب پر مشتمل سلسلہ پر سورہ بقرہ کی آیت نمبر 110 کے آخر کے درج مفہوم پر اعتراضات اور اُن پر جوابات ارسالِ خدمت ہیں۔

اس پوسٹ میں قرآن کی سورہ بقرہ کی آیت نمبر 110 کے آخری حصہ کا مفہوم یوں بیان کیا گیا

اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (2:110)

بے شک تمہارا کوئی عمل اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل سے اُوجھل نہیں۔

میری اس پوسٹ پر ایک محترمہ کی طرف سے اعتراض سامنے آیا کہ

"I fully agree what have said but why do you replace the word 'Allah' and 'Rabb' with 'Qanoon-e-makafat'? This is unnecessary complication. Here the words مکافاتِ عمل is not a replacement of Allah."

جواب:۔

میں آپ کی اُلجھن سمجھ سکتا ہوں۔ آیت کا لفظی لغوی ترجمہ آپ کو یہی لکھا ہوا ملتا ہے کہ

''بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُسے دیکھ رہا ہے''۔

میرے خیال میں یہ ترجمہ مسئلہ زیرِ بحث کی پوری حقیقت کی عکاسی کرنے میں ناکافی ہے۔ قرآن نے واضح طور پر اعلان کیا ہوا ہے کہ اللہ کا طبیعی وجود نہیں ہے' لہٰذا اللہ کے دیکھنے کا مطلب محض دیکھنا کی طرح نہیں لیا جا سکتا بلکہ اُس دیکھنے کا مقصود قانونِ مکافاتِ عمل کو سامنے لا کر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دیکھنے کا مقصد اور مفہوم یہی بنتا ہے کہ ہم تمہارے اعمال سے باخبر ہیں تا کہ اسے (کراماً کاتبین سے) باقاعدہ ریکارڈ کرا کے اُس کی یوم الحساب کے موقع پر جزا دی جائے۔ اسے ہی قرآنی اصطلاح میں قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس مقصد کے بیان سے آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے' اس لئے اس کا مفہوم یوں درج کیا گیا ہے۔

It seems that this brief reply was found unsatisfactory, So the following Question was again raised Which I think appeared under the impression that a Law-abiding Allah ceases to be the "All-Powerful Allah". But one does not cease to have power if one submits to a law voluntarily.

However the question now some what with details was raised as follow:-

"Thank you for your explanation but I feel that changes the emphasis and power of this verse entirely. Moreover it imbues the translation with an element of personal interpretation and opinion rather than staying as true to the content of the Quran as revealed."

You have presented ayat of the Quran with what appears to be a translation immediately afterwards. The 'mafhoom', as far as I can see it, seems to be bracketed. In the ayat quoted yesterday, 'Makafat-e-amal' was presented with what appeared to be translation, rather than exposition. Secondly, by using such terms to replace a name, you reduce Allah's being to a mere physical law. Which He is not. This is an attempt to rationalise Islam, to bring it in accordance with modern thought, based on the assumption that modern thought is flawless. Belief is not always rational. And each day of our lives many things come to pass around us that make absolutely no sense. The rich and corrupt continue to get richer, unchecked. No makafat-e-amal

seems to hound their unholy actions. Insaani zaat to bilashuba tabah ho rahi hai, as you have noted. But its consequences are not necessarily immediately forthcoming.

By the way, this change of Allah's name is exactly what erased mention of Muhammed (saw) from the sacred texts of the Yahud o Nasara. 'Muhammed' (saw) became translated as 'The Praised One' and over centuries, became lost to history. He is mentioned as 'the Praised One' even in some Sanskrit texts, I am told.

مجھے خوشی ہے کہ آپ میری پوسٹ پر تبصرہ کرنے کے لئے وقت نکال رہی ہیں۔ اگر قانونِ مکافاتِ عمل کا پورا موقف جانے بغیر آپ کے تبصروں کا یہ اعلیٰ سٹینڈرڈ ہے تو پورا موقف جاننے کے بعد اس سٹینڈرڈ میں مزید اضافہ لازمی لگتا ہے۔ لہٰذا اس سٹینڈرڈ کو دیکھتے ہوئے میں اپنی تصنیف "نظریۂ پاکستان اور قرآن" بذریعہ ای میل آپ کی اجازت لئے بغیر ارسال کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ اسے تبصرہ کے قابل سمجھیں گی۔

مجھے البتہ اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ سمجھ رہی ہیں کہ اللہ کو اُس کے اپنے قانون کا پابند کر کے اس کے اختیار پر پابندی لگانے کی روش اللہ کی شان میں کمی کرنے کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہاں میرے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ میں قانونِ مکافاتِ عمل کی ذرا تفصیل سے وضاحت کر دوں۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا قرآنی تصور

قانون سے مراد یہ ہے کہ:۔

اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔

اسے انگریزی میں ان مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ

IF---------- Then ---------- Always

جیسا کہ ہم ذرا آگے چل کر دیکھیں گے کہ اللہ کے تمام کلمات، اصول، سنت اور وعدے سبھی قانون کی تمام شرائط پر پورا اُترتے ہیں۔ اسی طرح تمام کائنات کا مدار اللہ کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ مکافاتِ عمل کے معنی ہیں کہ ہر کام اپنا متعین نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔ خارجی کائنات کی ہر شے مجبور پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہاں ہر حرکت کا متعینہ نتیجہ از خود مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کو (Law of cause and effect) کہا جاتا ہے۔ انسان کو صاحبِ اختیار بنایا گیا ہے، اس لئے یہ اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق بھی زندگی بسر کرتا ہے اور ان کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے۔ جب وہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تعمیری

ہوتا ہے۔ اور جب یہ ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کا نتیجہ تخریبی ہوتا ہے۔ لہٰذا جس قسم کے افراد ہوں گے اُسی قسم کا معاشرہ ہوگا۔ اس طرح افراد اور معاشرہ دونوں کا دارومدار قانونِ مکافاتِ عمل پر ہوگا۔ کائنات کی کوئی شے یا نظام اس قانون کے احاطہ سے باہر نہیں۔ یہی بات مندرج آیت کے مفہوم میں کہی گئی ہے۔

انسان کو اس بات کا اختیار تو ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کے قوانین کی اطاعت کرے اور چاہے تو خلاف ورزی لیکن وہ اپنے اعمال کے نتائج مرتب کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ وہ اللہ مرتب کرتا ہے، جس میں تبدیلی نہیں کی جاتی۔ انہی میں قانونِ مکافاتِ عمل بھی شامل ہے۔ اسی بات کی نشاندہی اور اس کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یوں کی ہے کہ

گندم از گندم بروید جَو ز جَو
اَز مکافاتِ عمل غافل مشو

(یعنی گندم کے دانہ سے گندم کا پودا ہی اُگتا ہے اور جو کے بیج سے جو کی کونپل پھوٹتی ہے۔
اس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس قانون سے آپ کو غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ مدیر)

قرآن کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہونے کی بنا پر اختیارِ مطلق بھی رکھتا ہے۔ اُس نے البتہ اپنے اختیارِ مطلق کا نفاذ ہر شے کو ایک قدر (قانون) کے تابع رکھ کر منوایا ہے۔ وہ قادرِ مطلق کی حیثیت سے پورا اختیار رکھتا ہے کہ وہ کسی بات کا پابند ہو اور اُسے تبدیل نہ کرے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کلمات یا سنت (قانون) میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اُس کی قادرِ مُطلقیت کی شان میں مجبوری کے عنصر کو شامل کر کے اُس کو مجبور بنا دیا گیا ہے۔

''ہم اپنی روزمرہ کی زبان میں قادرِ مطلق اُسے سمجھتے ہیں، جو اپنے یا کسی اور کے قانون اور ضابطہ کا پابند نہ ہو اور ان کی خلاف ورزی کرنے میں بھی کوئی مجبوری محسوس نہ کرے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ اگر قادرِ مطلق کی یہ تعریف درست ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اِس صورت میں اللہ مجبور ہے اور حضرت انسان قادر ہے۔ اس لئے کہ حضرت انسان تو ہر روز قانون توڑتے اور وعدہ خلافی کے مرتکب ہوتے ہیں جبکہ اللہ کا خود قرآن کریم میں یہ واضح اعلان ہے کہ

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115)

اور اللہ کے کلمات (قوانین) عدل اور صِدق کے ساتھ (قرآن میں) مکمل کر دیئے ہیں۔ اُس کے کلمات میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

مزید یہ بھی کہ

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (35:43)

''اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں ہوتی''۔

اس ضمن میں یہ بھی وضاحت ہے کہ اللہ خود بھی اپنے قوانین اور وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

اور یہ بھی کہ عالمِ امر کے بعد عالمِ تخلیق میں

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (33:38)

''اللہ کا ارادہ (امر) خدا ہی کے مقررہ پیمانوں اور اندازوں کا پابند ہو گیا''۔

اللہ کی حکومت انسانوں پر بادشاہت اور آمریت جیسی طرزِ حکومت نہیں ہوتی کہ جو جی چاہا کیا بلکہ وہ مستقل اور غیر متبدل قوانین دیتا ہے اور انہی کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت اور قدرت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے اللہ کی مرئی شخصیت نہیں بلکہ اُس کے قوانین ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کے قانونِ مکافات کے ذکر سے خود اللہ سے چشم پوشی کرنے کا منطقی طور پر کوئی جواز نہیں بنتا اور اس سے مزید رسولِ اکرم ﷺ کی ذات کے انکار کا جواز نکالنا حقیقت سے بعید ہے۔

یہ نکتہ بھی شاید آپ نے بے خیالی میں مروّج سوچ سے مطابقت میں پیش کیا ہے کہ

Belief is not always Rational.

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مکافاتِ عمل کا یہ موضوع ہمارے عقائد کا حصہ ہے اور ضروری نہیں کہ وہ عقلی، منطقی اور قانونی معیار پر پورا اُترے۔ لہٰذا ایسا ہاں عقلی، منطقی اور قانونی پیمانہ کی سند قابلِ قبول ہونے کا درجہ نہیں رکھتی۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے لئے تو رسولِ اکرم ﷺ کی سنت ہی راہنمائی اور سند ہے جو قرآن کی سورہ یوسف کی آیت نمبر 108 میں یوں ملتی ہے کہ

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)

(اے رسول!) ان سے کہہ دو: میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں تمہیں بصیرت (خدا کی طرف دلائل و براہین) کی رو سے دعوت دیتا ہوں، میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔

قرآن نے اسی لئے مومنین کی نشانی بتائی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73)

اُن کے سامنے اور تو اور جب آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو اُن پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں لپکتے (بلکہ علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے ہیں)۔

اس سے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اِرشاد خداوندی یہی ہے کہ عقل و بصیرت کی رو سے دین کو پیش کرو اور دلیل و برہان کی رو سے اس کو مانو۔ یہ سنت رسول اللہ ہے اور ایسا ہی کرنے کا جماعتِ مومنین کو حکم دیا گیا ہے۔ دین کی دعوت دینے میں، جو شخص اس طریق کو اختیار نہیں کرتا، وہ ارشاد خداوندی سے سرکشی برتتا ہے اور سنتِ رسول اللہ کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن تو نازل ہی عقل سے کام لینے کے لئے ہوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (12:2)

ہم نے عربی (زبان میں) قرآن اس لئے نازل کیا تا کہ تم عقل سے کام لے کر اچھی طرح سمجھ سکو۔

ہماری اس بحث میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے ایک اور صاحب نے اسی پوسٹ میں کمنٹس دے کر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ

"Though its an interesting detail....but Sir! we have to make Qur'an easy even for common people to understand rather than complicating it....using easy urdu and english for this purpose is the best way....this type of discussion is helpful only for those who have a very deep insight and critical spiritual and analytic perception of language system....and this way such questioning and details generate Ibham regarding Qur'an and its different interpretations....for commoners."

ان کمنٹس کے بعد محترمہ کی طرف سے آخری کمنٹ یوں موصول ہوا اور میں شکر گذار ہوں کہ اس میں اُنہوں نے دوسرے صاحب کے اعتراض کا جواب دے کر میری مشکل بھی آسان کر دی۔

"Uncle Inaam, thank you for such a well-considered reply to my objection. I am humbled. I agree with all your points. And you have well-construed my fear that by replacing Allah's name with the theory of 'makafat-e-amal', we may unwittingly be initiating a departure from belief in Him. Aside from this objection, by which I continue to stand for reasons you well understand, I agree with all that you have shared in your last few posts. Our debate has sparked my interest however, and I shall be following your posts more attentively from now on. Thank you very much for your book about the ideology of Pakistan and the Quran. Let me also take this opportunity to urge you to please continue to post your tafheem of the Quran in the language that you choose to - the general public most definitely needs to improve its standard of discourse and thought. Besides, the Quran is written in too noble a style to be reduced to the limited verbal prowess of everyday conversation. The public does indeed need urgently to raise its standards.

☆.....☆.....☆

Surah *Al-Naba* (النباء) – Durus-al-Qur'an Parah 30: Chapter 3

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends! Today is June 1, 1984 and today's lecture starts with verse 23 of Surah *Al-Naba* (النباء) (78:23).

Nature of Hell

After discussing the confrontation between Truth (*Haq* حق) and Falsehood (*Baatil* باطل) I explained in several of my past lectures about what actually the Quran says of the nature of Hell. It says that Hell always pursues and waylays its victims – us humans. In fact, it has us surrounded from all sides today; it sees us that we are burning in this Hell. One day it will appear in front of us and we will see it but it is watching us today while we are engulfed in its punishment. I have mentioned this again and again that we have to believe in the Hell and Heaven of the Hereafter. But we cannot understand its essence and reality, here, in this world. We will find that out when we get there. But the Hell and Heaven start right from here, in this world. As for Heaven, unfortunately, our eyes never had any glimpse of it. But, want about Hell? Well! We are living in it – each and every one of us – although we seem to be unaware of it. The Quran says: لِّلطَّاغِينَ مَآبًا (78:22) – For the transgressors a place of destination. لَّٰبِثِينَ فِيهَآ أَحۡقَابًا (78:23) – They will dwell therein for ages [Yusuf Ali]. How long? – My dear friends! The sense of time and its duration will be qualitatively different in the Hereafter than the time and duration that happens at the conscious level here, in this world. If we get into deeper aspects of time and the related philosophy behind it then its terrain will become quite complex and will take us into the realm of metaphysics. But this is not necessary because the Quran has presented hell and heaven; judgment and punishment; accountability and balance etc. of the Hereafter – in a metaphorical

way. Therefore, we cannot know their essence and reality here.

The reality of time and duration

The question of exactly how long people will live in Heaven or Hell cannot be answered because our perception of time changes when our state of consciousness changes even in this world, what to say of its change after death. We keep track of serial time when we are awake and we have a sense of its duration. We know the time when Sun sets and when it rises on this serial scale. But when we wake up after sleep we do not know how much time elapsed during sleep because our conscious mind is switched off during sleep and it only comes back when we wake up. We are conscious of time only when our conscious mind is on; and when it is off we lose all contact with time. I have given this only as an example to illustrate the point that the issue of time is very broad and deep. But there is no need to get into this debate. The Quran has used the word "أَحْقَابًا" (*Ahqaaba*) in verse (78:23) which means a time whose duration is not determined. In the Quran, "خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا" (*Khaalidina fihaa Abadaa*) comes again and again, which means "forever" in relation to both Hell as well as Heaven. As a matter of fact, at one place on this issue the Quran says: خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (11:107) – therein to abide as long as the heavens and the earth endure – unless thy Sustainer wills it otherwise [Asad]. These are some realties and when knowledge advances further it maybe that these realties could be understood about what the Quran is saying here. In any case, these will get manifested after death since the cover will be lifted from their face. But, as I said before, there is no need to get into this discussion as this is unrelated to our practical life here. We have to believe in these realities as described by the Quran: that there is life after death; and that the results of all our actions performed in this world *will* appear in the Hereafter. We have to believe that we would be held accountable for all our actions in the world. The foundation of Islam (*Deen*) rests on the law of requital which works incessantly all the time here and will continue to work in the Hereafter.

Therefore, there is no need for us to get into debate about the length of this period mentioned in verse (78:23).

State of Muslims

Our pathological condition has become such that we engage in debates about the number cups in heaven, and the length and breadth of the fountain of abundance (حوض کوثر) of the Hereafter; but we do not see the current hell we are living in. If only we could *see* this hell then we would realize that all of us are living a life of hell about which the Quran says that its flames engulf the hearts; and whose fuel – in the words of Iqbal (1877-1938) – humans bring themselves to the Hell. These are humans' own triggered flames burning in their hearts: flames of greed and envy; flames of suspicion; flames of race and competition. Have you ever thought how some people, who have it all, still want more because the flame of jealousy is burning in their hearts? So, they become flames of hell. We find it here, in this world itself, how this flame does not let them rest in peace. And, in return, this triggers different kinds of flames of suspicions. How serious are these flames of suspicions? Well! Its seriousness can be judged from the fact that the Quran in its last chapters goes so far as to warn humans directly and succinctly to beware of those who are engaged in spreading these flames; and it advises people to ask for shelter – and then the Quran ends.

But ask for shelter from whom? The entire society is engulfed in hell. And the security guard of hell is named Master for whom all these people are slaves. And the condition inside the hell is such that: لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ; اِلَّا حَمِيمًا وَّغَسَّاقًا (78:24-25) – Neither coolness shall they taste therein nor any (thirst-quenching) drink – only burning despair and ice-cold darkness [Asad].

The Nature of Hell

My dear friends! If we apply the above scenario to our current hellish society then we can easily see how the flames of hell have engulfed our hearts. We have come now to

the last parts of the Quran. In chapter *Al-Muzammil* we saw how the Quran in describing the fate of transgressors mentioned that they will be given: وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (78:13) – food that chokes. Think about what their condition would be! What kind of food is this that chokes? And they are told: ذُقْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ (44:49) – Taste it - thou who (on earth) hast considered thyself so mighty, so noble! Now eat this food that chokes. You were posing as magnanimous and powerful in society; pretending to be a respected leader; and a great benefactor of society – but the wealth you had acquired by wrong means – now get a taste of this, which you could neither swallow nor throw up. These types of wealthy people seem outwardly to be living in great comfort but if one peeks into their hearts one finds that their hearts are engulfed in flames of greed, envy, suspicion, and anxiety. This is reflected by their body language as well. You see all these big elites sitting on enormous piles of wealth which they acquired by illicit means. They look like they are having good time sitting on these piles of wealth but these are really flames of hell that they are engulfed in.

My dear friends! The hungry suffer from lack of food. Their pain is physical. But these elite and wealthy groups suffer because their hearts are burning with flames of hell. You see corruption, black-marketeering, smuggling, nepotism, cronyism everywhere – speaking in modern terms. And these are not the only illicit things. The whole environment has become so toxic that taking a breath of fresh air has become difficult. Don't ask what kinds of secret schemes these elites come up with to hide their ill-gotten wealth. They keep running from place to place carrying their wealth and in the words of the Quran "death seems to come but does not come." There is neither life nor death in their hellish life. To hide their wealth they suffer even more heartache constantly. Please take a careful look at how the illicit means of accruing sustenance have spread like wildfire. If you have even a slight awareness of it then you can feel that every kind of sustenance is becoming fuel for this fire and making it uncontrollable. The Quran has explained this at the individual level. But, it takes altogether a different character at the collective level.

Manifestation of Quranic realities with time

My dear friends! When I pondered on this issue in the light of the Quran I found out that its claim that its realities will manifest themselves in every period *is* based on truth. There are many terminologies of the Quran whose meanings have manifested only in our period. They were not manifested before maybe because we couldn't have understood them. There is an extraordinary verse in the Quran: لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ; لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ (88:6-7) – No food for them save the bitterness of dry thorns, which gives no strength and neither stills hunger [Asad]. The Quran has used the word "ضَرِیع" (*Daree'a*) for their sustenance. Look at the meaning of this very comprehensive word "ضَرِیع" (*Daree'a*) and connect it with the political situations of nations today, and you will exactly understand how beautifully the Quran depicts the prevailing human condition in this just one word!

Let us take this scenario: You are standing on a beach. What do you see there? – Useless junk and thorny objects like prickly dry branches of thorny bushes. These things float on the surface of the ocean and are dumped away at the beach by powerful waves. (When I used to go the beach in Karachi I used to see even little pieces of coal. Beggars and poor children used to roam around the beach and used to collect these things.) Among these things are thorny dry branches which even the animals don't eat. The Arabs used to call them "ضَرِیع" (*Daree'a*). Now, look at this picture: the huge ocean containing unlimited treasure and sustenance has discarded useless junk from its surface and dumped them at its shore. And poor and deprived children collect these discarded useless junk referred to as "ضَرِیع" (*Daree'a*) in Arabic. Why I am emphasizing this point so much will become clear soon. With time these Quranic realities have manifested, and can be understood now.

The "favor" of developed nations on undeveloped nations

My dear friends! Developed nations today give aid to undeveloped nations. What is this aid? This is exactly what the Quran calls "ضَرِیع" (*Daree'a*) – the stuff discarded

by the waves of their economic ocean. And, we, standing on the shore pick our sustenance from their discarded junks. This is hell my friends! They never give their good stuff – whether military equipment or other items. They throw their crumbs and bones and we are only too eager to pick them. This is "ضَرِیع" (*Daree'a*).

What to say of this word "ضَرِیع" (*Daree'a*) and what to say of the Quran for using it in this context! Only in today's political environment did its meaning become uncovered as to what the Quran has said here. The nations which are called "Third World Countries" are made dependent and destitute; and their resources are plundered and looted while the leftover crumbs that are thrown at them – while humiliating enough in themselves – do not even satisfy their hunger, let alone provide strength: لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ (88:7) – which gives no strength and neither stills hunger. That is how these superpowers give aid to poor nations – while all the while sucking their blood. In essence they become masters while these poor nations become their slaves. The master nations determine their national policies – nothing remains their own in their own countries. Their life, their sustenance, and their resources – all of these are actually in the hands of the imperial superpowers. What is left for them are leftovers, throwaways, and adulterated stuffs. Even the food does not remain what the label says. Fakery becomes common and reality disappears into thin air from the society. Religion presents itself in the garb of *Deen* (دین) which is nowhere to be found. Children have no idea of the real thing because they have not seen it. Even the medicines are largely impure as pure ingredients are not available. Is it not then the hell in which we are living?

Is it not Hell?

My dear friends! We hear about foreign medicines all the time that such and such medicine is bad after it has been in use for a many years. Drug companies fight each other for market share. Their bottom line is profit. Many times they put up warning labels after thousands die. "ضَرِیع" (*Daree'a*) also emanates like this. Is there any

doubt about this being Hell? The Quran says: لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ (88:7) – which gives no strength and neither stills hunger. You go and look at the faces of children after they come out of schools. What kinds of faces do you see? You see weak and skinny faces as if they do not have enough blood in them. This is – لَّا يُسْمِنُ (88:7). Did you see what kind of Hell we are living in? In fact, the whole world is living in this Hell. The Masters of Hell, the imperial powers, are in charge of this Hell. And, the rest of the nations feel helpless. They are given nothing: إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (78:25) – Save a boiling fluid and a fluid, dark, murky, intensely cold. The Quranic metaphors are so unique and so to the point. They get water alright but it is either too hot or it is too cold. We know that water is essential for farming but if it is too hot or too cold then the plants die. It is essential that water temperature be within normal range for it to be life-giving. But this is possible only when water is available. These days even water is becoming scarce. Is there any doubt that they are in Hell?

So, whether rich who are sitting on piles of wealth or poor barely surviving on leftover crumbs – all are living in hell: Rich because of the flames of their greed and envy; poor because of the flames of their hunger and misery.

Also, one might think that humans will be driven like livestock and given nothing: إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (78:25) – Save a boiling fluid and a fluid, dark, murky, intensely cold. To dispel this notion the Quran immediately said: جَزَاءً وِفَاقًا (78:26) – A fitting recompense (for them) [Yusuf Ali]. This will be the result of their actions. وفاقً (*Wifaaq*) means something that fits exactly. So, the state they are in is the precise result of their own actions. And: إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (78:27) – For that they used not to fear any account (for their deeds). They used to think in their hubris: who is there to question us; that who is there to hold us accountable? Well, only in a wrong (*Baatil* باطل) system these megalomaniacs engage in this kinds of behavior and remain under the false impression that no one is there to hold them accountable.

Humans imprisoned in their own falsehood

My dear friends! Those who possessed lot of wealth and engaged in falsehood

(*Baatil* باطل) remained under the false impression that no one could touch them: وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا (78:28) – They called Our revelations false with strong denial. When they were told that oppressors will pay for their crime one day, they used to mock at the Prophet (PBUH) and his companions: You say that oppressors won't be successful but we are highly successful and we are accountable to none. This was their behavior. The root of all the evil is the human mindset that no one can hold them accountable. The Prophet (PBUH) used to tell them: Even if no one is watching, there is One who is; if there is no one who can hold you accountable, there is One who will. Belief in this one supreme Authority is the source of all virtue: The belief – even if there are no external observers to keep a watchful eye on me – that my actions, my thinking, even my desires produce results; and that these results are stored within me and will come out one day at appropriate time. Those who have blood cancer look fine for a long time and when they feel the symptoms the disease becomes essentially incurable. Similarly, the results of human actions remain within them for a long time and it is wrong to think that "law of requital" does not work; it is wrong to think that there is no one who will hold us accountable. Those who lead very comfortable lives in the world when asked what will happen to them after death, they give the usual reply: that there is nothing to worry; that all this warning about accountability is only to instill fear; that we have made sure of our success in the hereafter by building an orphanage here and a mosque there, and by giving to charities. This way they believe a house will be built for them in heaven; no matter their wealth may have been earned by sucking the blood of others. These are the people who do not believe in the "law of requital" – that every action produces its consequence.

Getting to heaven is not so cheap

These people live in self-deception. They live in God-deception also. They think that they will live a comfortable and good life in the Hereafter just as they are doing it here, in this world. Listen to any preacher's sermon. He tells that rich people who give

their wealth for charitable causes – for building a mosque or an orphanage or a madrasah – it will get multiplied manifolds in the Hereafter; and that a house will be ready for them when they get there. But this is all self-deception, and in the words of Iqbal (1877-1938) God-deception as well. The bottom line of their belief is that we will not be held accountable. Although the reality is: وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا (78:29) – but We have placed on record every single thing (of what they did) [Asad]. So, how can they get away with what they did to pile all those wealth in the world? Where could they run? They will be told there: ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (44:49) – Taste it - thou who (on earth) hast considered thyself so mighty, so noble! And: فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا (78:30) – And so We shall say: "Taste, then, (the fruit of your evil doings) for now We shall bestow on you nothing but more and more suffering!"[Asad]. In contrast to them the Quran says: اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (78:31) – But, verily for the God-conscious there is supreme fulfilment in store. [Asad]

Meaning of salvation

My dear friends! Although we have discussed this issue in detail before but since we are coming to end of the Quran I want to explain this issue one more time (probably the last time) in such a lucid manner that it gets engraved in your hearts and minds. The wrong concept which all the religions of the world had about salvation – the Quran struck it in just one word by presenting its reality. In all religions, salvation means to get rid of all kinds of individual suffering by penance, prayer, rituals, sacrifices, spiritual practices, etc. It is akin to being sick and getting cured and becoming healthy as before – that is, it is to return to the original state! This is called salvation. This is the aim of all religions.

The question is: all these tough rituals, practices, and sacrifices – what are these for? Every religion has this concept that initially man is good; then he suffers punishment. And salvation from this punishment and suffering is achieved by prayers, by sacrifices, by giving charity, etc. This is the ultimate goal of religion. That is, nothing

positive was achieved but one became what one was before after all these religious activities. All the religions of the world believe in this. The Hindu belief in transmigration is to ultimately achieve salvation after going through millions of excruciating transmigration cycles. The Christian belief in the original sin is similar. Christians believe that every human child on his birth is born with the burden of the original sin and that this cannot be erased by any act except belief in the atonement of Jesus. The only way the child may be relieved of this sin and achieve salvation is by believing in the crucifixion and atonement of Jesus as a matter of faith. Again, the ultimate goal is to become as you were. The Jews, first of all, believe that heaven is reserved only for them; and that no one else can go to heaven except them. They believe that their elders committed some sin during Sabbath and therefore children of Israel will go to hell for few days. But their elders will come to their defense and plead to God and He will allow them to carry the children of Israel with them to heaven. Again, the idea is: you will become as you were.

My dear friends! Strangely enough Muslims also believe in salvation! Here is how. Accounting will happen and they will be thrown in hell. Regarding hell they have strange belief as if it is a sanatorium – where a sick person is sent to recover from illness and after the illness is cured he becomes healthy as he was before. This is the concept of Muslim salvation. Some say hell is like a cleaner's furnace where dirt from the clothes is washed away, and the clothes become clean and shining as before. So, all these different excruciating stages for achieving salvation in different religions is, in principle, the same – to become as one was before. Mystics came and claimed that the priests do not know how to achieve salvation. Hindu mystics follow Vedanta and it says that man's soul is part of God's soul. After separation it got trapped in in the world and is crying to rejoin with God. All the mystical exercises are done so that the original soul that is trapped in man is able to rejoin with God. Again, the same ultimate goal: to become as it was before.

Mystical practices and their result

My dear friends! Mystical practices are even more difficult than religious ones. As it is, fasting in the month of Ramadan in summer is difficult enough due to longer summer days. But praying *Taraweeh* until late at night and waking early for *suhoor* – going through all these is not easy. Why to do all these? – To become as you were before after all your sins are forgiven, so that the human soul having separated from God's soul is able to go back to its original source. And, what about all these things – the order and system of the Universe; the foundation and machinery of life; sending down of revelation; guidance of messengers; obedience of Divine laws; life, death, and accounting? Are these just for the purpose to somehow become as before?!

What do you think of all this? What kind of concept of God do you get from this? – That all this enormous work and giant machinery of the Universe is just so one becomes as one was before?!Why didn't God then let man be like before without going through all these troubles? Why did God go through all this work anyway? Why did God give disease? – That physicians could practice medicine and cure people and make money? Is God a Physician that He could practice medicine (of the soul) and cure the sick soul to how it was before? – Alright! You have been cured, next one please? What has happened to us? Are we tirelessly engaged in constant effort to achieve nothing in end? How tasteful that must be?! Ghalib has put it beautifully:

This throng of despair would, in dust, disappear;

What great this taste is, in aimless strivings, there!

Human beings derive great pleasure in these aimless strivings and useless concepts. And, according to our religious and spiritual guides the aim is to become as one was before – and Allah's system; Allah's *Deen*; His Islam; His revelations; and His messengers – all of these are to achieve this aimless goal?!

My dear friends! The Quran declared all these concepts that were coming down

through the ages as false (*Baatil* باطل). In Islam there is no concept of salvation. In Islam there is achievement (مَفَازًا); there is accomplishment; there is realization of human potential – to greater and greater levels. It is not to get rid of some misfortune but to achieve something positive.

Wholeness of humanity – man's place is higher than every place

Completeness of humanity – this is to continue on life's evolutionary path, stage by stage, where every stage gets higher and higher; where life continues to rise on the universal development and nourishment index. *This* is مَفَازًا (*Mafaazan*) or achievement, although مَفَازًا (*Mafaazan*) is a much more comprehensive term – it is to reach the ultimate pinnacle of humanity. This is not to become "as you were before". The entire spectrum of life; its different stages; its actions in harmony with divine code of life; sending down of revelation – all these are meant to develop and realize the latent potentials within humans and to channel their energy step by step to higher and higher levels in this world; and, since life is a continuous flowing eternal stream, to continue this development process to the next stage of human life in the Hereafter. *This* is the meaning of life according to the Quran.

My dear friends! You can see from this how the Quran put an end to this hugely false (*Baatil* باطل) concept of "as-you-were" and gave a positive meaningful goal of life "to achieve life's potential, to achieve fullness of its very being" – starting from here, and continuing to the Hereafter: حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ; وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا – luxuriant gardens and vineyards, and splendid companions well matched (78:32-33). What these exactly will be in the Hereafter we cannot say? The Quran only describes them as examples or metaphors as we have emphasized many times before. But, all these nutritious things mentioned above, are essential for good of the health in this life; and obviously if these are available to a nation then it is better than a nation which gets only that which the Quran has called "ضَرِیع" (Daree'a). But even if all this abundance is available –what they are used for is another question. The answer is coming next.

Humankind's goal is to remove roadblocks in its way

My dear friends! We had seen in the last lecture that the meaning of شیطان (Satan) is: "The Hinderer". To remove roadblocks from the path of Truth (*Haq* حق) so that the caravan of humanity could reach its destination – this is the goal of دین (*Deen*). The reason believers (مومنین) are able to develop their latent human potential is precisely through this struggle of removing these roadblocks and freeing human beings from all kinds of bondage and oppression that they suffer in the world at the hands of hinderers in the path of humanity. The believers (مومنین), i.e., those who rise up in the way of Allah are supposed to remove the roadblocks erected in the way of downtrodden, oppressed, and weak people of the world, so that they are able to move forward their caravan of life on the highway of life without any hindrance. *This* is the goal of دین (*Deen*). The heavenly life will then be available to them in this world itself: حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ; وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا – luxuriant gardens and vineyards, and splendid companions well matched (78:32-33).

The meaning of وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا (*Wa Kawa'iba Atraabaa*)

My dear friends! If one looks into the traditional translations and interpretations of this verse "And young full-breasted (mature) maidens of equal age [Al-Hilali & Khan]" then it seems that these translators and interpreters are obsessed with women and their sexual role – although كَوَاعِبَ (*Kawa'ib*) which is derived from *Ka'b* (كعب) means "prominence", "eminence" or "glory" (Lisan al-Arab). So, this one word كَوَاعِبَ (*Kawa'ib*) means all these things – glorious and well respected honorable eminent women. And whatever noise we hear regarding women's rights issues these days, the Quran solves these issues in just one word أَتْرَابًا (*Atraaban*). We can explain this with an example: A potter makes different kinds of objects from the same lump of clay. Their shapes may be different but they are made out of the same clay. Similarly, from the same clay (أَتْرَابًا *Atraaban*) both man and woman are made. So, if you think about it – is there any doubt about the essential equality of man and woman even

though their forms are different? Aren't all the basic women's rights and related issues that have plagued humanity are to put to rest by the Quran in a single word "أثرَابًا *Atraaban*". Looking from another angle the Quran solves all of the afflictions of intra-women problems as well – like mutual envy and jealousy, rivalry, mistrust etc. – by saying that since *all* women are made from the same clay (أثرَابًا *Atraaban*) then all of these problems are, in fact, artificial. So, women should not think of other women as being of lesser value. If they do, then this makes them and, consequently, the clay (أثرَابًا *Atraaban*), of lesser as well. If women respect the clay, then they respect womanhood as a whole: "Whatever you think of the clay that is what your position will become." What to say of the Quran my friends! In just this simple example the Quran has solved a very complex problem facing the humanity or ages. That is why the Quran is a challenge to all man-made distinctions that separate humankind from one another. Take for example just this verse: (78:33) وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا. (*Wa Kawa'iba Atraabaa*). It is impossible to translate this verse.

My dear friends! The next verse is: وَّكَاْسًا دِهَاقًا (78:34) – And a full cup [Pickthall]. كاس means cup but the Arabs were a strange people. The word "دِهَاقً" (*Dihaaq*) has certain characteristics: whatever drink is in the cup it must be full and must be pure and clear. Sustenance should be available but it must be pure and fulfilling – this is called heaven. Maybe it is fulfilling but not pure – then it will not be called "دِهَاقً" (*Dihaaq*). Even the word "رزق" (*Rizq*) has the characteristics that it must be available when needed and must fulfil the requirement.

Different characteristics of "رزق" (*Rizq*)

My dear friends! "رزق" (*Rizq*) means sustenance. But it has the added conditions that it must be available when needed and must be satisfying and fulfilling. If these conditions are met then only it will be called "رزق" (*Rizq*) in Arabic. The Quran requires that this must be available to all: وَّكَاْسًا دِهَاقًا (78:34). Next it says: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا (78:35) – There hear they never vain discourse, nor lying

[Pickthall]. When humans get intoxicated with wealth then don't ask what kinds of vain discourses they indulge in?! But in a society established on the principles of the Quran nothing like that happens: man does not get intoxicated with power or wealth; he does not belie the Divine code of life – because in this society the sustenance will be halal; it will be pure and fulfilling; it will be available when needed; and it will be equally open and accessible to all. But the question is: this sustenance, this "رزق" (*Rizq*), would be available in exchange for what? Regarding this the Quran says: جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا (78:36) – (All this will be) a reward (recompense) from thy Sustainer, a gift in accordance with (His Own) reckoning [Asad]. "حِسَابًا" (*Hisaaban*) means: after receiving this recompense there would be no need for anything else. What to say of that (heavenly) society when these things prevail! – The sustenance will be halal; it will be pure and fulfilling; it will be available when needed; and it will be equally open and accessible to all. There is no way it would ever get short of demand or run out of supply because this is: رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (78:37) – (a reward from) the Sustainer of the heavens and the earth and all that is between them, the Most Gracious! (And) none shall have it in their power to raise their voices unto Him. He is not just responsible for humankind's sustenance but of the entire Universe and everything in it. [Asad]. There is no question of shortage of His sustenance to anyone unlike we have in our society on a daily basis. The Quran says: رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ (78:37) – Allah has provided sustenance for whatever is within the heavens and the earth (i.e., in the entire Universe). In this verse the word "بَيْنَهُمَا" requires special attention.

The limitless Universe, civilized nations, and the universal system of sustenance

My dear friends! The Universe is so vast that even the scientists could not fathom the reality of deep space until recently. But they are now busy in research; and due to their efforts some planets have now come within the reach of humans. Scientists are also busy investigating the possibility life elsewhere in space beyond our earth. They

have discovered that life did exist on certain planets. But the Quran mentioned this more than 1400 years ago. Who knows how many civilizations may have existed elsewhere in this Universe. The Quran says that whenever a curtain is lifted by human knowledge behind some deep mystery of the Universe it will always validate the truth of a certain claim of the Quran made 1400 years ago. You already know the meaning of *Al-Rahman* (الرَّحْمٰن) and *Al-Raheem* (الرَّحِيم): *Raheem* (الرَّحِيم) means one who provides sustenance in a normal progressive manner; and *Rahman* (الرَّحْمٰن) means one who provides sustenance in emergency situations, or in an emergent manner. And: لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا (78:37) – (And) none shall have it in their power to raise their voices unto Him. That no one can interfere in it, because He is the absolute sovereign; and He is responsible for the sustenance of everything. There is in this verse (78:37) some important point to ponder.

The reality of coming down on Earth of *Malaaika* (مَلَآئِكَةْ) and *Al-Ruh* (الرُّوحُ)

My dear friends! The next verse is: يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا (78:38) whose traditional translation is "The Day that the Spirit and the angels will stand forth in ranks [Yusuf Ali]". The Quran affirms that this unique period *will* come one day on earth. *Malaaika* (مَلَآئِكَةْ) are the cosmic forces of nature. The word "*Al-Ruh*" (الرُّوحُ) has been used in the Quran for revelation (*Wahi* وَحْيٌ). In the hellish picture that exists in the falsehood (بَاطِل) system of the world today, what is missing? Everything is there today – knowledge, science, and technology. There is so much control over the unlimited powers of *Malaaika* (مَلَآئِكَةْ), the forces of nature; but the benefits derived from them are not being used within the guidelines of revelation (*Wahi* وَحْيٌ). Maybe religious and spiritual nations think that they are working under its guidance but they do not have control over the forces of nature. The power of revelation (*Wahi* وَحْيٌ) and the power of *Malaaika* (مَلَآئِكَةْ), the forces of nature, are working in separate ways.

Life of West – reason for its hell

My dear friends! The right system is when the forces of nature, the *Malaaika* (مَلآئِکَۃ), and the guidance of the revelation, (*Wahi* وَحْیٌ), stand forth in ranks: يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا (78:37). Not the one ahead and the other behind, but, together, one reinforcing the other. The West has been able to turn the whole world into hell because it has conquered the forces of nature alright, but it has used them for the benefit of their national interests. The West has turned the world into a slaughter house; it has made it a prison; it has turned it into a place of persecution; it has destroyed and continues to destroy nations after nations. This has happened because they have conquered the material forces of nature, the *Malaaika* (مَلآئِکَۃ), but they do not have the guidance of the revelation (*Wahi* وَحْیٌ). On the other hand, religion claims to be working under the guidance of the revelation (*Wahi* وَحْیٌ) but it has abandoned the material world; it has spread hatred against it; it has encouraged indiscretions against it; and has removed itself from it. But there is no way one can fly with only one wing. Both the wings – the material forces of nature, i.e., the *Malaaika* (مَلآئِکَۃ), and the guidance of the revelation, i.e., (*Wahi* وَحْیٌ) – are both required to work in harmony for humanity's success. When the forces of nature, the *Malaaika* (مَلآئِکَۃ), bowed down in front of Adam, the Quran says: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) – there shall, none the less, most certainly come unto you guidance from Me: and those who follow My guidance need have no fear, and neither shall they grieve. Only when the guidance of the revelation, (*Wahi* وَحْیٌ), and the material forces of nature, the *Malaaika* (مَلآئِکَۃ), work together in unison will the real benefit come to humanity as a whole. This is what the Quran has said in verse (78:38) – the period when these two forces (the *Malaaika* (مَلآئِکَۃ) and the revelation *Wahi* وَحْیٌ) work together and stand side-by-side – only that period will produce a heavenly society in the world.

Relationship of *Malaaika* (مَلآئِکَۃ) and revelation (*Wahi* وَحْیٌ)

My dear friends! When *Malaaika* (مَلآئِکَۃ) and revelation *Wahi* وَحْیٌ) work together

and stand side-by-side, only then the human actions will produce the desired results. Then: لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (78:38) – none will speak but he to whom the Most Gracious will have given leave; and (everyone) will say (only) what is right [Asad]. That is, no one will be able to interfere during this period. Everything will happen according to the Divine law in this period and people will only say that which is in accord with this law and most suitable with respect to time and place. These will be the people who will establish a society where the guidance of the revelation, (*Wahi* وَحْيٌ), and the material forces of nature, the *Malaaika* (مَلٰٓئِكَةُ), will work together for the benefit of humanity as a whole: ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ (78:39) – this will be the period of *the* Truth (الْحَقُّ). Did you notice that this period has been called the Day of Ultimate Truth? And the door is open to everyone: ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (78:39) – That will be the Day of Ultimate Truth: whoever wills, then, let him take the path that leads towards his Sustainer [Asad]! But: اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا (78:40) – Verily, We have warned you of suffering near at hand. Please notice here, once again, that this is not about the Hereafter because the word "قَرِيبًا" in this verse signifies nearness. These people had been warned about the impending destruction. How nice of Allah that He warns beforehand: Do not go near that; otherwise, you will suffer destruction and death? And that day will be near "قَرِيبًا". And the Quran says: يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (78:40) – on the Day when man shall (clearly) see what his hands have sent ahead [Asad].

Action first, result later

My dear friends! Please pay careful attention to this term: "Action first, then the result": مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (78:40) – what his hands have sent ahead. Someone has sent things ahead considering he is going to come there after sometime – so that he will have these things when he gets there. These will be the results of his own actions, and not given to him as baksheesh. What has been sent? If it is evil, then he will suffer destruction; if it is good, then he will have life. Whosoever violated or rejected the divine laws will suffer the consequences: وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا (78:40) – and when he

who has denied the truth shall say, "Oh, would that I were mere dust!" [Asad]. He would say: “I wish I was a lump of clay; that I didn't have the power of freewill – then I wouldn't have to suffer this accounting and questioning now.” What to say of the Quran, my friends?!

My dear friends! Those who knew that they will face the consequences of their actions one day; those who feared that they will be questioned and held accountable for their actions – they should remember the final words of Caliph Umar (581-645) when he was martyred. He picked a dry straw and said: I wish instead of Umar I were this straw then I wouldn't have to fear for accountability. This is the meaning of كُنتُ تُرَابًا (*Kuntu Turaabaa*) – I wish I was lump of clay.

My dear friends! This was the last verse of Surah Al-Naba (النباء). In the next lecture we will take up Surah *An-Naziat* (النّازعَاتِ). This is a unique and extraordinary Surah. The Quran outlines in this Surah the purpose of this group (of the Prophet (PBUH) and his companions) that was being prepared and trained for the ultimate revolution. What are the functions of the *Malaaika* (مَلآئِكَةٌ) and “*Al-Ruh*” (الرُّوحُ)? What is the meaning of *Deen*? What is the significance of Islam? Why is the party of Islam needed? The first verses in this Surah consist of just two words each. But the entire system of Islam is contained within these ten words. We will take up these verses in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

☆.....☆.....☆

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.68
ISSUE
2

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

حوصلہ نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو

قرآن، پریشاں خاطر وافسردہ حال، حیران وسرگرداں، راہ گم کردہ انسانیت کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O (3/138) تم تباہی و بربادی کی مہیب قوتوں سے مت خوف کھاؤ۔ تاریک مستقبل کی اندوہنا کیوں اور ہلاکت سامانیوں سے مت گھبراؤ۔ جی نہ چھوڑو۔ حوصلہ نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو۔ میں جو نظام پیش کرتا ہوں اس کی صداقت پر بھروسہ کر کے، اسے عملاً آزماؤ اور پھر دیکھو کہ تم شکست وریخت کی ان تمام قوتوں پر غلبہ پا کر کس طرح خاک کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچتے ہو۔ (علامہ پرویزؒ کی کتاب مفہوم القرآن جلد اول صفحہ نمبر 12 سے ایک اقتباس)